قرآن اور شوق مطالعہ

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... قرآن اورشوق مطالعہ(سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ..

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214، 04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور شوق مطالعہ" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

کیا قرآن مجید میں ایسی آیات پائی جاتی ہیں، کہ جن سے زیبائی شناسی کا طریقہ معلوم کیا جا سکتا ہے؟ 7
قرآن مجید میں زیبائی شناسی کے مظاہر: 10
قرآن مجید میں زیبائی کا اصول: 12
ایمان کیا ہے؟ 18
ایمان سے وابستگی 24
اسلام کی نظر میں ایمان سے وابستگی 25
جنت میں کون لوگ جائیں گے؟ 28
ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ 30
کامیابی اور امام پر اعتقاد کا کردار 31
کن لوگوں کے اعمال قابل قبول ہیں؟ 33
دارالحسرۃ اور یوم الحسرۃ میں کیا فرق ہے؟ 36
الٰہی ادیان کا ایک ہی ہونا کیسے ممکن ہے؟ 40
الف: دین کی حقیقت: 41

ب: قرآن مجید میں دین کے معنی: 41

ج: دین کے مرحلے اور سطحیں: 41

د: اسلام مستحکم دین ہے: 43

ھ: مذاہب کا منسوخ ہونا اور شریعتوں کا اختلاف: 44

و: قرآن مجید اور آسمانی کتابیں: 46

فنا کیا ہے اور مقام فنا کیا ہے؟ 48

عرفا کی نظر میں فنا کی تعریف: 50

مقامِ فنا: 50

فنا کے مقام کو پانے کا طریقہ کار: 51

کیا قرآن مجید کی نظر میں حکمت اور علم کے درمیان کوئی فرق ہے؟ 55

قرآن مجید میں علم و حکمت: 58

حکمت اور علم میں فرق: 60

آیہ شریفہ واذا الوحوش حشرت میں حیوانات سے مراد کیا ہے؟ کیا حیوانات کا بھی آخرت میں حشر اور سوال و جواب ہوگا؟ 64

حشر کے لغوی اور اصطلاحی معنی: 66

حیوانات کا حساب و کتاب (حشر و نشر): 67

حیوانات کا علم و شعور: 67

حیوانات کا محشور ہونا اور انسان کے محشور ہونے سے اسکی شباہت: 68

خلقت انسان کا مقصد کیا ہے؟ عقلی دلیل بیان کیجیئے۔ اگر اس کا مقصد کمال ہے، تو اللہ نے انسان کو پہلے ہی سے کامل کیوں پیدا نہیں کیا؟ 72

الف۔ پیدائش کے بارے میں خداوندمتعال کا مقصد:	73
ب۔انسان کو پیدا کرنے میں خدا کا مقصد:	75
ج۔خدا نے انسان کو کیوں مکمل پیدا نہ کیا؟	78
د۔کافر اور گناہگار انسان:	79
ابلیس کو کیوں آگ سے پیدا کیا گیا ہے؟	81
ا۔شیطان کا امتحان:	82
۲۔انسان کا امتحان:	82
قرآن مجید کے الفاظ اوران کی ترکیب، وحی پر مشتمل ہونے کا ثبوت، شرعی احکام کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید سے تمسک پیدا کرنے میں کس قدر موثر ہے؟	84
قرآن مجید، خداوند متعال کے آخری نبیؐ کا معجزہ ہے، اس کے اعجاز کی صورتیں کیا ہیں؟	87
ا۔قرآن مجید کا لفظی معجزہ:	89
۲۔قرآن مجید کا مفہومی معجزہ:	90
۳۔قرآن مجید کا، لانے والے کے لحاظ سے معجزہ:	93
مختلف تفاسیر کے پیش نظر آیہ شریفہ: لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ‌ۙ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ‌ۚ ۔۔۔کا مفہوم کیا ہے؟	95
اسلام میں مرتد کو کیوں قتل کیا جاتا ہے؟ کیا یہ کام عقیدہ کی آزادی کے خلاف نہیں ہے؟	101
کیا انسان اپنے کام میں مختار ہے؟	109

کیا قرآن مجید میں ایسی آیات پائی جاتی ہیں، کہ جن سے زیبائی شناسی کا طریقہ معلوم کیا جا سکتا ہے؟

مختصر جواب

زیبائی کے مختلف معنی ہیں، جیسے: شائستہ، نیک، جمیل اور خوشنما، اور اصطلاح میں ظہور اور کمال پر اوڑھے گئے ایک شفاف پردہ کے معنی میں ہے۔ بنیادی طور پر چار قسم کی زیبائی پائی جاتی ہیں۔ محسوس زیبائی، نامحسوس زیبائی، معقول زیبائی، خداوند متعال کی مطلق زیبائی اور جمال۔

قرآن مجید کی روشنی میں، انسان کی زیبائی، فطرت کی زیبائیاں اور معنوی اور اخلاقی زیبائیاں، زیبائی کے مظاہر شمار ہوتی ہیں۔

اسی طرح، زیبائی شناسی کے بعض اصول قرآن مجید میں یہ ہیں: ہدف مندی، تناسب و توازن، نظم و ترتیب، تنوع و تضاد، رنگوں کی زیبائی کا تنوع اور عیوب کو چھپانا۔ قرآن مجید میں زیبائی شناسی کا طریقہ، ہستی شناسی کی بنیاد اور معرفت شناسی کے پیش نظر ہے اور مغربی طرز فکر کی زیبائی شناسی سے فرق رکھتا ہے۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید انسان کی ہدایت کے لئے ایک کتاب ہے، جس کو خداوند متعال نے

اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے، تاکہ انسان کے لئے تمام حقائق کو اس کے ذریعہ بیان کرے، اس لحاظ سے خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[1]

ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شئے کی وضاحت موجود ہے۔۔۔

اس بنا پر قرآن مجید میں ایسے بہت سے مفاہیم پائے جاتے ہیں، جو انسانی طرز فکر کی اصلاح کے سلسلہ میں کلیدی رول رکھتے ہیں، قرآن مجید میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جس مفہوم کے بارے میں کثرت سے آیات مخصوص ہیں، وہ زیبائی کا مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ دقیق طریقہ کار کو حاصل کرنے کے لئے اس کی تعریف اور حدود کو معین کیا جانا چاہئے اور اس کے بعد اس کے مفروضات اور مبانی سے استفادہ کر کے آیات اور مصادیق میں غور و فکر کرنا چاہئے تاکہ زیبائی شناسی کا طریقہ کار تشکیل پائے۔ زیبا کے لغت میں مختلف معنی ہیں، جیسے: شائستہ، نیک، جمیل اور خوشنما۔ زیبائی، یعنی، خوبصورتی کی حالت اور کیفیت، جیسے: وہ نظم و ہم آہنگی جو کسی شے میں عظمت و پاکی ہوتی ہے، جو انسان کی عقل، تخیلات اور عالی میلانات کی تحسین کرتی ہے اور لذت و انبساط پیدا کرتی ہے[2]۔

اصطلاح میں بھی زیبائی کے بارے میں متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف کی بنا پر زیبائی ایک ہم آہنگی اور ہارمونی ہے جو ہماری لذتوں کو ایک معین راہ میں تشکیل دیتی ہے اور زیبائی کے تصور کا سبب بن جاتی ہے[3]۔ علامہ محمد تقی جعفری اس نکتہ کو بیان کرتے ہیں کہ خلقت کی زیبائی کے ایک مظہر پر غور کرنے سے، انسان ایک زیبا حس حاصل کرنے کے علاوہ کمال تک بھی پہنچتا ہے، وہ زیبائی کی یوں تعریف کرتے ہیں: کمال پر اوڑھا ہوا ایک شفاف پردہ۔ اس تعریف کی بنا پر زیبائی وہ ہے کہ جو انسان کو اپنی زیبائی کی حس کو دور کرنے کے علاوہ کمال تک بھی پہنچاتی ہے[4]۔

زیبائی کی مختلف قسمیں ہیں، ہر مکتب فکر نے اپنی ہستی شناسی کے مبانی کے مطابق اس کی مختلف قسمیں کی ہیں۔

لیکن کلی طور پر چار قسم کی زیبائیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔محسوس زیبائی،مثال کے طور پر، پھولوں اور جنگلوں کی زیبائی

۲۔ نامحسوس زیبائی،مثال کے طور پر، آزادی،علم وغیرہ کی زیبائی

۳۔ قابل قدر معقول زیبائی، مثال کے طور پر، حکمت، عدالت اور دوسری روحانی عظمتیں

۴۔لم یزلی ولا یزالی، مطلق زیبائی و جمال[5]۔

قرآن مجید، اپنی نورانی آیات میں زیبائیاں بیان کرتا ہے اور انسان کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان زیبائیوں کو حاصل کرنے کی سفارش کرتا ہے، خواہ یہ زیبائیاں معنوی ہوں مادی ومحسوس ہوں۔ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ صرف زیبائی کو جائز جانتا ہے، بلکہ زیبائیوں کو حاصل کرنا، انسان کی روحانی ضرورت کے عنوان سے مطلوب ومحبوب جانتا ہے[6]، ارشاد الٰہی ہے:

اور وہی وہ ہے جس نے سمندروں کو مسخر کر دیا ہے تا کہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھا سکو اور پہننے کے لئے زینت کا سامان (موتی) نکال سکو۔۔۔[7] قرآن مجید کی آیات اپنی بے مثال بلاغت کے سبب زیبائی شناسی میں تفکر کرنے کا حیرت انگیز راز ہیں [8]۔ اس بنا پر قرآن مجید، خود زیبائی کا مظہر ہے اور اس میں زیبائی شناسی کے مظاہر اور خوبصورت نشانیاں پائی جاتی ہیں اور قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند متعال تمام زیبائیوں کا سرچشمہ ہے اور اس نے کائنات اور اس کی نعمتوں کی خلقت میں زیبائیوں کو مدنظر رکھا ہے۔

قرآن مجید کی آیات میں،زیبائی کے لئے کچھ الفاظ اور مفاہیم استعمال ہوئے ہیں۔ جوایک تقسیم بندی کے مطابق حسب ذیل ہیں:

۱۔ جمال (بہت خوبصورت، حسن (شادی اور دل پسند)، زینت (زیبائی کا مطلب، جوکسی چیز میں اضافہ ہوتا ہے)۔ یہ تین الفاظ زیبائی کےمحور ہیں۔

۲۔حلیہ(آراستگی)،بہجت (زیبائی،خوشی،شادی)،زخرف(زینت،خوشنما،زرق برق)اورتسویل(آرائش کرکے بدصورت کوخوبصورت بناکرپیش کرنا)

۳۔ وہ الفاظ، جنہیں بعض تفسیروں کی بنا پر زیبائی کے دائرے میں قرار دیا گیا ہے،مثال کےطور پر:حبک (زیبائی)اورتبرج (زینت نمائی)

۴۔وہ الفاظ، جوزیبائی کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، جیسے: نور،لون،قدر

قرآن مجید میں زیبائی شناسی کے مظاہر:

قرآن مجید، اپنے بلند مقاصد کے سلسلہ میں،ہستی کی بعض زیبائیوں،معنوی اور اخلاقی زیبائیوں کی کچھ مثالیں اور آخرت کی زیبائیوں کی ایک جھلک ہمیں دکھاتا ہے، جو حسب ذیل محاوروں میں بیان کی گئی ہیں:

الف۔انسان کی زیبائیاں:

قرآن مجید نے انسان کے رشد و بالیدگی کے مراحل بیان کیے ہیں اور ان کے موزوں اورمعتدل ہونے کی یوں تاکید فرماتا ہے: ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا ہے۔[9] اورانسان کواس زیبائی کے ساتھ پیدا کرنے کے بعد خداوندمتعال اپنے آپ کو آفرین کہتے ہوئے ارشادفرماتا ہے: کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جوسب سے بہترخلق کرنے والا ہے۔[10] بیشک، انسان کے اعضا کا تناسب اور ہرایک عضو کا اپنی مخصوص جگہ پر قرار

پانا اور ان کا منظم اور دقیق کام انجام دینا اور ان کی زیبائی نے سائینسدانوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور حیرت اور تعجب کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

یہ زیبائی، صرف انسان کی ظاہری صورت نہیں، بلکہ یہ اس کے روحانی اور باطنی پہلو پر بھی مشتمل ہے اور اس سے کمال و سعادت کے بلند ترین مراتب میں بھی راہنمائی کی جا سکتی ہے۔

ب۔ طبیعیت کی زیبائیاں:

ہر نظریہ کا قائل انسان جب طبیعیت (فطرت) کا نظارہ دیکھتا ہے تو اس کے عجائبات اور زیبائیوں کا مشاہدہ کر کے وجد میں آتا ہے اور اس کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ فلک بوس پہاڑ، بہتے دریا، سورج کا ایک جگہ سے طلوع ہونا اور دوسری جگہ غروب ہونا اور بجلی اور کڑک وغیرہ میں چکا چوند کرنے والی زیبائیاں ہیں، قرآن مجید نے ان زیبائیوں کو بے جان اور جاندار طبیعیت کے قالب میں پیش کیا ہے اور اس طرح زیبائی شناسی کا ایک نیا باب کھولا ہے۔

طبیعیت (فطرت) سے متعلق آیات کو طبیعتی آیات کہا جاتا ہے اور مفسرین نے اس قسم کی آیات کی تعداد ۷۵۰ سے زائد بتائی ہے اور ان کی بھی مختلف قسمیں کی گئی ہیں جو آسمان اور دوسرے مظاہر کی زیبائیوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں پر ہم اس قسم کی چند آیتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا ہے کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور پھر آراستہ بھی کر دیا ہے اور اس میں کہیں شگاف بھی نہیں ہے[11]۔

۲۔ بیشک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین بنا دیا ہے[12]۔

۳۔ ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا ہے۔[13]

۴۔ اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ کر دیا۔[14]

ان آیات کی مزید مثالوں کو سورہ ضحیٰ کی آیت ۱، مدثر، آیت ۳۴، کہف، آیت ۸۶، نمل آیت ۶۰، حج، آیہ ۵ اور ق، آیت ۸۔۱۱ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ج۔ معنوی اور اخلاقی زیبائی:

اسلام کی زیبائی شناسی اور مغربی ہیومنزم (Humanism) کی زیبائی شناسی کے اصولوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام نے زیبائی کو طبیعی اور قابل حس زیبائیوں سے بالاتر وسعت دے کر معنوی اور اخلاقی زیبائیوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے: خدا نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کیا ہے۔۔۔[15]

صبر و بخشش بھی ان امور میں سے ہیں جو ایک طرح کی زیبائی ہیں: لہٰذا آپ بہترین صبر سے کام لیں۔[16] بخشش کی زیبائی: پس ان کے بارے میں شائستہ طور پر چشم پوشی کرو۔[17] طلاق کی زیبائی: پیغمبر؛ آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ زندگانی دنیا اور اس کی زینت کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں متاع دنیا دے کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں۔[18]

اس سلسلہ میں قرآن مجید نے متعدد آیات بیان کی ہیں، من جملہ سورہ مزمل کی آیت ۳۷ اور سورہ احزاب کی آیت ۴۹۔

قرآن مجید میں زیبائی کا اصول:

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے زیبائی کے عوامل اور نشانیاں معلوم کی جا سکتی ہیں جو

پروردگار عالم کے نظام ہستی کی خلقت کی خصوصیات شمار ہوتی ہیں، ان میں سے بعض عوامل حسب ذیل ہیں:

۱۔ بامقصد:

قرآن مجید کی زیبا شناسی کے اصولوں میں سے ایک اس کا بامقصد ہونا ہے، چونکہ قرآن مجید کی دعوت کی بنیاد مخاطب کی ہدایت اور الٰہی ومعنوی پیغاموں کی طرف دلچسپی دکھانا ہے۔ زیبائی اور ہنرمندی کو صرف ان کے مادی دائرے میں تعریف نہیں کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی داستانوں کے بارے میں جب فن کاری کے لحاظ سے بات کی جاتی ہے اور ان داستانوں کے محتویٰ کو خوبصورت عبارتوں میں نمایاں کیا جاتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ داستان سرائی اور ادبی وفنی جلووں کی زیبائی ہی زیبائی شناسی کا موضوع ہے، بلکہ اس کے ذکر کا مقصد انسان کی ہدایات اور پروردگار کی لامحدود قدرت کی یاددہانی کرانا ہوتا ہے[19]۔

۲۔ تناسب وتوازن:

عالم ہستی کا نظام نہایت گہری اور حساب شدہ منظم بنیادوں پر تشکیل پایا ہے، اس نکتہ کو ان آیات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

بیشک ہم نے ہر شے کو ایک اندازہ کے مطابق پیدا کیا ہے[20]۔

ہر شے کا اس کے نزدیک ایک معیار معین ہے[21]۔

اس نے ہر شے کو خلق کیا ہے اور صحیح اندازے کے مطابق درست بنایا ہے[22]۔

اس نے ہر شے کے لئے ایک مقدار معین کی ہے[23]۔

جس نے پیدا کیا ہے اور درست بنایا ہے، جس نے تقدیر معین کی ہے اور پھر ہدایت دی ہے۔[24]

۳۔ منظم اور زیبا نظم و ترتیب:

کائنات کے نظم وانتظام کی اہم نشانیوں میں سے ایک اس کا منظم ہونا اور زیبا نظم و ترتیب ہے، قرآن مجید میں اس کا مختلف صورتوں میں ذکر کیا گیا ہے:

اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے ہیں اور ہر چیز کو معینہ مقدار کے مطابق پیدا کیا ہے [25]۔

وہ برابر سے بچھے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے [26]۔

اور قطار سے لگے ہوئے گاؤ تکیے ہوں گے [27]۔

ان کے لئے جنت کے غرفے ہیں اور ان کے غرفوں پر مزید غرفے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ [28]

۴۔ تنوع اور تضاد:

نظام ہستی پر حاکم نظام میں وحدت اور ہم آہنگی کے علاوہ اس میں حیرت انگیز تنوع بھی پایا جاتا ہے، جو جمادات، نباتات اور حیوانات اور انسانوں کی قسموں میں مشہور ہے:

اور زمین کے متعدد ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغات ہیں اور زراعت ہے اور کھجوریں ہیں جن میں بعض دو شاخ کی ہیں اور بعض ایک شاخ کی ہیں اور سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں اور ہم بعض کو بعض کھانے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس میں بھی صاحبان عقل کے لئے بڑی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ [29]

۵۔ زیبائی اور رنگوں میں تنوع:

قرآن مجید کی آیات کی ایک تعداد مختلف رنگوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآن مجید نے سبز رنگ کو نعمت، شادی، اور بہشتی رنگ کے عنوان سے یاد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

ان (بہشتیوں) کے اوپر کریب کے سبز لباس اور ریشم کے حلّے ہوں گے اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔[30]

زرد رنگ کو مسرت لانے والے رنگ کے عنوان سے یاد کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

ایک ایسی گائے ہو۔ جو زرد رنگ کی ہو، کہ اس کا رنگ دیکھنے والوں کو شاد اور مسرور کرے۔

اس کے علاوہ رنگوں کے نمونوں کو سورہ نحل آیت ۱۳، سورہ فاطر آیت ۲۷، ۲۸، اور سورہ زمر آیت ۲۱ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ عیبوں سے پاک ہونا:

پروردگار کی خلقت کی نشانیوں میں سے ایک اس کا عیب ونقص سے پاک ہونا ہے۔قرآن مجید کے سورہ ملک میں آسمان کی زیبائی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

اس کے بعد بار بار نگاہ ڈالو، دیکھو، نگاہ تھک کر پلٹ آئے گی لیکن کوئی عیب نظر نہ آئے گا۔[31]

پروردگار عالم کی خلقت کا عیبوں سے پاک ہونا، قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے[32]۔

حواشی

[1] نحل،89.

[2] معین،محمد،فرہنگفارسی،تہران،موسسہانتشاراتامیرکبیر،1360ھ ش.

[3] خرقانی،حسن، مفاہیم زیبائی شناختی درقرآن،مجلہ مطالعات اسلامی،ص 11، سال 1387ھ ش، شمارہ 80.

[4] جعفری،محمد تقی،زیبائی و ہنر از دیدگاہ اسلام، ص 174،موسسہ تدوین آثارعلامہ جعفری،

تہران،1385ھ ش.

[5] ایضاً،ص162و163.

[6] ایضاً،ص133۔136، انتشارات شرکت سہامی چاپخانہ وزارت ارشاد اسلامی، بلا تاریخ.

[7] نحل،14.

[8] فضیلت،محمود، زیبائی شناسی قرآن،ص22،طبع دوم،انتشارات سمت،تہران،1387ھ ش.

[9] تین،4.

[10] مؤمنون،14.

[11] ق،6.

[12] صافات،6.

[13] فصلت،12.

[14] حجر،16.

[15] حجرات،7.

[16] معارج،5.

[17] حجر،85.

[18] احزاب،28.

[19] ایازی، سید محمد علی، اصول ومبانی زیبایی شناسی قرآن کریم، پا تبیان ویب سائٹ.

[20] قمر،49.

[21] رعد،8.

[22] فرقان،2.

[23] طلاق،2.

[24] أعلی،32.

[25] حجر،19.

[26] طور،20.

[27] غاشیہ، 15.

[28] زمر، 20.

[29] رعد، 4.

[30] انسان، 21.

[31] ملک، 3.

[32] مزید آگاہی کے لئے ملاحظہ ہو: حسن خرقانی، مفاہیم زیبائی شناختی درقرآن، مجلہ مطالعات اسلامی، سال 1387ھ ش، شمارہ 80، ص 11؛ مہدی مطیع، مبانی زیبائی شناختی درقرآن، قرآن بہ مثابہ نظریہ پردازی زیبائی شناسی، فصلنامہ ہنر، سال 1385ھ ش، شمارہ نشریہ، 70، ص 210؛ حسن بلخاری، بنیان ہای نظری زیبائی شناسی اسلام درقرآن کریم، فصلنامہ ہنر، سال 1385ھ ش، شمارہ نشریہ، 70، ص 164 تا 171.

ایمان کیا ہے؟

مختصر جواب

ایمان انسان کا ان معنوی امور کی جانب دل کی گہرائیوں کے ساتھ میلان ہے جنہیں وہ مقدس سمجھتا ہے اور ان سے متعلق عشق و محبت اور شجاعت کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق ایمان کے دو بال و پر ہیں: علم اور عقل، تنہا علم کفر کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے اور تنہا عمل منافقت سے بغل گیر ہوسکتا ہے۔

ایمان کی واقعیت اور حقیقت کے سلسلہ میں متکلمین اسلام کے درمیان تین نظریہ موجود ہیں:

1۔ اشاعرہ کی نظر میں ایمان کا مطلب، خداوند اور پیغمبروں کے وجود اللہ کے امر و نہی کی تصدیق کرنا ہے۔

2۔ معتزلہ کی نظر میں ایمان کا مطلب، خدا کے بتائے ہوئے فرائض و احکام پر عمل کرنا ہے۔

3۔ فلاسفہ متکلمین کی نظر میں ایمان، یعنی کائنات عالم کی واقعیت اور حقیقت سے علم و آگاہی اور اس کے ذریعہ نفس کو کمال تک پہنچانا؛ اور عرفاء کی نظر میں ایمان کا مطلب، خد اسے لَو لگا کر خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے روگردانی کرنا ہے۔

مغرب (یورپ) اور عیسائیت میں ایمان سے وابستگی دو نئے طریقہ سے شکل پاتی

ہے۔

1۔ افراط کی بنیاد پر ایمان سے وابستگی، جہاں عقل کو بالائے طاق رکھ کر، دینی تعلیمات اور خدا و ماورائے طبیعت پر ایمان کے سلسلہ میں عقل کا سد باب کر دیا گیا ہے۔

2۔ اعتدال کی بنیاد پر ایمان سے وابستگی، کسی حد تک ایمان اور اصول دین کی تقویت کے سلسلہ میں عقل و استدلال کے قائل ہیں جب کہ ایمان کو عقل پر مقدم سمجھتے ہیں۔

مفکرین اسلام کے درمیان بعض عرفاء اور اخباریوں کا نظریہ افراط کی بنیاد پر ایمان سے وابستہ رہنے والوں کے مشابہ ہے جب کہ امام غزالی اور مولوی کو کسی حس تک اعتدال کی بنیاد پر ایمان سے وابستہ رہنے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

محسوس یہ ہو رہا ہے کہ بے سر و پا اور خشک پیچیدہ فلسفی استدلال نے نئے طرز کے ایمان سے وابستگی کی زمین ہموار کی ہے۔

تفصیلی جواب

ہر جاندار کے دل میں کوئی نہ کوئی آرزو و تمنا ہوتی ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے؛ انسان بھی مادی دلچسپی کے علاوہ کچھ معنوی چیزوں جیسے، علم و معرفت، خوبصورتی وغیرہ سے دلچسپی رکھتا ہے، ایمان بھی انسان کی ایک قسم کی آخری آرزو کی طرح ہے جہاں دیگر تمام دعوے تحت الشعاع قرار پاتے ہیں۔ ایمان کا دائرہ ہر انسان کے لئے ایک مقدس دائرہ ہے، یعنی انسان کی آخری آرزو آخر کار ایک مقدس امر میں بدل جاتی ہے اور وہیں سے شجاعت، عشق و محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ایمان کا تعلق ہمیشہ ایک معین امر سے ہے، اسی لئے مومن کو چاہئے کہ اس کا علم رکھے[1]۔

لفظ ایمان کی مختلف مذہب و مسلک کی بنیاد پر متعدد تعریفیں کی گئی ہیں علامہ

طباطبائی ایک شیعہ فلسفی اور مفسر قرآن کے عنوان سے ایمان کے یہ معنی بیان کرتے ہیں:

ایمان تنہا علم و معرفت کا نام نہیں ہے اس لئے کہ بہت سی آیتیں ایسے افراد کے بارے میں مرتد ہونے کی خبر دیتی ہیں جو علم وآ گاہی کے باوجود منحرف اور مرتد ہوئے ہیں، بلکہ مومن کو چاہئے کہ علم کے ساتھ ساتھ اپنے علم کے تقاضوں پر بھی عمل کرے اور علمی تقاضوں کے تحت دل لگائے تا کہ آثار علم اس سے نمایاں ہوں، لہٰذا اگر کسی شخص کو یہ علم ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور وہ اپنے اس علم کے مطابق عمل بھی کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی عبادت کی انجام دہی میں تسلیم ہے اور ایسا ہی شخص مومن ہے [2]۔

چونکہ قرآن مجید میں انسانوں سے خدا کا تقاضا ایمان کی بنیاد پر ہے اور سیکڑوں آیتوں میں مختلف طور پر تاکید کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے کہ ایمان کے ذریعہ اپنی نجات کا راستہ مہیا کرو [3]۔

اسی لئے علمائے اسلام کے لئے ایمان کے معنی کی خاص اہمیت ہے۔

ایمان کی حقیقت و واقعیت کے سلسلہ میں متکلمین اسلام کے درمیان تین بڑے نظریئے موجود ہیں:

1۔ اشاعرہ کی نظر میں حقیقی ایمان سے مراد: خدا اور رسولوں کے وجود کی تصدیق اور انبیاء کے ذریعہ خدا کے بیان شدہ امر و نہی کی دل سے تصدیق کے ساتھ زبان سے ان کا اقرار کرنا ہے۔ یعنی نمایاں و آشکار حقیقتوں کو قبول کر کے ان کی گواہی دینا۔ یہ حالت ایک طرف خضوع اور تسلیم ہونا (قلبی لگاؤ) ہے تو دوسری طرف تصدیق وشہادت کے موضوع سے فعال رابطہ ہے [4]۔

2۔ معتزلہ کے نزدیک ایمان سے مراد: واجبات و احکام پر عمل کرنا اور انجام دینا ہے۔

خدا اور رسولوں کی تصدیق خود ایک قسم کا وظیفہ پر عمل کرنا اور دیگر فرائض واجبات کو انجام دینا اور محرمات کو ترک کرنا ہے جو شخص اپنے تمام فرائض پر عمل کرتا ہے وہ مومن شمار ہوتا ہے، معتزلہ کی نظر میں ایمان عمل سے وجود پاتا ہے نہ کہ نظریہ سے [5]۔

3۔ اکثر و بیشتر فلسفیوں کے نزدیک حقیقی ایمان سے مراد: کائنات عالم کی حقیقت و واقعیت سے متعلق فلسفیانہ علم و آگہی ہے۔

دوسرے لفظوں میں، نفس انسانی کا نظریات کے اعتبار سے کمال کی طرف سیر کرنا حقیقی ایمان کو شکل دیتا ہے لہٰذا واجبات کو انجام دینا اور محرمات کو ترک کرنا (جو عملی اعتبار سے کمال کی جانب سیر ہے) اسی علم و معرفت کا ظاہری اثر ہے۔اور جتنا ہی زیادہ ایک مومن کا عقیدہ حقائق عالم سے مطابقت کرے گا اسی قدر اس کا ایمان کامل ہوگا [6]۔

جیسا کہ صدر المتالہین اسفار اربعہ کے پہلے سفر کے شروع میں الٰہیات بالمعنی الاخص کی بحث کرتے وقت لکھتے ہیں: ثم اعلم ان هذا القسم من الحكمة التى حاولنا الشروع فيها هو افضل اجزائها و هو الايمان الحقيقى بالله وآياته واليوم الآخر المشار اليه فى قوله تعالىٰ [و المؤمنون كل امن بالله و ملائكته و كتبه و رسله] وقولہ: [ومن يكفر بالله و ملائكته و رسله و اليوم آخر فقد ضل ضلالاً بعيدا] وهو مشتمل على علمين شريفين: احدهما العلم بالبداء و ثانها العلم بالمعاد، و يندرج فى العلم بالمبدء معرفة الله و صفاته و افعالة و آثاره و فى العلم بالمعاد معرفة النفس و القيام و علم النبوت [7]۔

جان لو کہ حکمت کی یہ قسم جس میں ہم نے شروعات کی ہے، حکمت کا سب سے افضل جزو ہے اور وہ اللہ، اس کی آیات اور روز قیامت پر حقیقی ایمان ہے، جیسا کہ اللہ کے

اس قول میں اشارہ ہوا ہے اور مومنین سارے کے سارے اللہ اس کے ملائکہ، رسولوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے ہیں اور خدا کا یہ قول جو بھی اللہ اس کے ملائکہ، رسولوں اور روز قیامت سے انکار کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوا اور یہ (ایمان) دو شریف علم پر مشتمل ہے ایک مبداء کا علم، دوسرے معاد کا علم، مبداء کے علم کے تحت، اللہ، اس کے صفات، افعال اور آثار کی معرفت ہے اور معاد کے علم کے تحت، نفس، قیام اور نبوتوں کا علم ہے"۔

اس نظریہ میں خدا اور رسولوں کی تصدیق ایک منطقی تصدیق کے معنی میں بیان کی گئی ہے، جو ایک ظاہری حقیقت سے مربوط ہے اور کائنات علم کی معرفت کا ایک حصہ ہے اور وظیفہ پر عمل کرنے کا مفہوم، ایمان کے مفہوم سے خارج ہے۔

مگر ہاں! عارفوں کی نظر میں ایمان نہ علم کا نام ہے نہ عمل کا اور نہ ہی شہادت کا نام ہے بلکہ ایمان کا جوہر غیروں سے روگرداں ہو کر خدا کی جانب متوجہ ہونا ہے:

الایمان هو الّذی یجمعك الی الله و یجمعك بالله و الحق واحد و المومن متوحد و من وافق الاشیاء فرہ الاهواء ومن تفرق عن الہ بھواہ واتبع شھوته وما یهواہ فاته الحق،

ایمان وہ چیز ہے جو تمہیں خدا کی طرف متوجہ کردے اور خدا کے نام پر ایک جا کردے، یعنی خدا پر ایمان لانے کا مطلب خدائے برحق کی جانب متوجہ ہونا ہے اور یہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ خدائے برحق کے علاوہ غیروں سے منہ نہ موڑیں، لہٰذا غیروں کی طرف جس قدر جھکے گا اسی قدر خدائے برحق سے منہ موڑے گا اور اسی مقدار میں ایمان بھی کم ہوگا، اس لئے کہ خدا کی طرف متوجہ ہونا ایمان ہے اور اس سے روگردانی کرنا اس کی ضد (**والضدان لا یجتمعان**) دو ضد آپس میں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں [8]۔

عیسائی متکلمین نے بھی ایمان کی تعریف میں زیادہ عارفوں کا طریقہ کار اپنایا ہے۔

ایان باربر لکھتا ہے:

تیلیخ نے کہا ہے کہ دین ہمیشہ آخری تمنا سے مربوط مسائل سے تعلق رکھتا ہے جس کی تین خصوصیات ہیں:

اول: آخری تمنا کا ہونا؛ یعنی بے قید و پیمان، بیعت وتسلیم ہونا۔ یہ موضوع زندگی و موت کا عنوان رکھتا ہے، کیونکہ زندگی کے معنی مدنظر ہیں جب کہ انسان اپنی زندگی کو اس انداز میں بسر کرتا ہے کہ یا وعدہ پورا کرے یا اس کام کے لئے اپنی جان دے دے۔

دوم: آخری تمنا ایسی قدر و قیمت وجود میں لاتی ہے جس کے مطابق تمام تر آرزوئیں نظم پاتی ہیں۔

سوم: آخری تمنا اپنے اندر ایک کامل اور جامع نظریہ اور زندگی کی راہ چھپائے ہوئے ہے، کیونکہ یہ انسان کے وجود اور زندگی کے ہر موڑ سے تعلق رکھتی ہے [9]۔

دوسرے مقام پر وہ رچرڈسن کے قول کو نقل کرتا ہے:

لفظ ایمان سے کتاب مقدس یا الٰہیات اہل کتاب کی مراد کیا ہے، یہ سمجھنے کے لئے اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ ایمان کا مطلب، دلیل و برہان کے ذریعہ ایک فکر یا نظریہ کے الہام سے کم نہیں ہے، یہ مسئلہ یقین کرنے کا ہے نہ کہ ثابت کرنے کا [10]۔

اس نظریہ کا مقصد ایمان کو علم ومعرفت اور برہان سے بلند و برتر سمجھنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ ایمان نہ عقل کے منافی ہے اور نہ ہی اندھی تقلید ہے۔

ہم عہد جدید کی بہت سی آیتوں اور عبارتوں میں ایمان کو اضطراب وخوف کے مد مقابل پاتے ہیں؛ ایمان یعنی ارادہ کی ہدایت اور راستہ کا ملنا، جوکہ ایک انسان کے اندر کسی قضیہ کی سچائی یا صحت پر یقین ہونے سے زیادہ اس پر اعتقاد پیدا کرنا اعتماد و بھروسہ سے پیدا

ہوتا ہے جو خدا، اس کی بخشش اور لطف و کرم پر توکل کے نتیجہ میں وجود پا تا ہے، بہر حال بھروسہ کرنا بھی انسانیت کا کام ہے اس لئے کہ خدا پر اعتماد کرنے سے انسان اپنی طاقت کو بھول جا تا ہے، خدا کی جانب متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس سے پہلے جن چیزوں پر اعتماد و بھروسہ کرتا تھا اس سے بیزار ہوجائے اور ان سے منہ موڑلے، ایمان کا لازمہ، ایمانداری، توکل، بیعت اور اطاعت ہے [11]۔

ایمان سے وابستگی

ایمان سے وابستگی کے لفظ کو (fideism) [12] کے مترادف استعمال کیا جاتا ہے یہ لفظ عقل سے وابستگی کے مقابلہ میں ہے جو اپنے کلامی معنی میں ہے، ایمان سے وابستگی کے نظریہ کے مطابق دین کی حقیقت ایمان پر مبنی ہے، عقل و استدلال کے ذریعہ حقائق تک نہیں پہنچا جا سکتا، اس دعوے کی تاریخ بڑی طویل ہے جو پولس قدیس کے زمانہ تک پہنچتی ہے، لیکن اس کا دبدبہ اور بول بالا انیسویں صدی سے آج تک مغرب اور عیسائیت میں زیادہ نظر آرہا ہے۔

ایمان سے وابستگی کی دوقسمیں ہیں، افراطی اور معتدل۔

1۔ افراط کی بنیاد پر ایمان سے وابستگی یا عقل سے دشمنی:

شستوف ایمان سے افراطی وابستگی رکھنے والا ایک شخص کہتا ہے: عقل کے تمام تر معیار کو رد کرنا سچے ایمان کا ایک جزو ہے

اس کا عقیدہ ہے کہ مثال کے طور پر انسان اگر دینی تعلیمات کی بنیاد پر کسی عقلی دلیل کے بغیر یہ ایمان لائے کہ ($2+2=5$) ہوتا ہے تو اس طرح کا ایمان اور یقین سچے ایمان کا ایک نمونہ ہے [13]۔

کی یرک گور اور سبھی افراط پسندوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دینی حقائق کی ماہیت کسی بھی طرح کی عقلی دلیل سے سازگار نہیں ہے اور دینی حقائق فقط ایمان کی بنیاد پر قابل قبول ہیں، اصول دین نہ صرف عقل سے بالاتر نہیں بلکہ عقل کے مخالف ہیں [14]۔

2۔ ایمان سے معتدل وابستگی یا غیر عقلی ایمان سے وابستگی:

اس طرح کا ایمان عیسائی سنت اگوسینی کے اندر موجود ہے۔

اس نظریہ میں ایمان عقل پر مقدم ہے۔ ہاں عقل و استدلال دینی حقائق کی جستجو اور انہیں سمجھنے میں کسی حد تک کردار ادا کر سکتے ہیں [15]۔

اسلام کی نظر میں ایمان سے وابستگی

ہر چند افراط کی بنیاد پر ایمان سے وابستگی کی ضروت اور زمین سازی (جس طرح عیسائیت اور مغرب دنیا میں ہے) اسلامی نقطہ نظر کے مطابق موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی اسلامی مفکرین کے آثار کے کچھ نمونے مغربی دنیا کے ایمان سے وابستگی کے مشابہ ہیں؛ مثال کے طور پر اخباری، گروہی اور جمودی رجحان نے ایمان کے نام پر دین میں دلیل و برہان، استدلال اور تعقل وتفکر کو ترک کر رکھا ہے۔

اسی طرح بعض اسلامی عارفوں کے کلام میں جیسے (محی الدین عربی) کی کتاب فتوحات مکیہ میں افراطی ایمان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں موصوف کی نظر میں اگر کوئی شخص عقل و فکر کی بنیاد پر ایمان لائے تو حقیقت میں وہ ایمان ہی نہیں لایا، اس لئے کہ سچا ایمان وہ ہے جو وحی کی بنیاد پر ہو جب کہ یہ ایمان عقل پر مبنی ہے [16]۔

امام غزالی کو اعتدال کی بنیاد پر ایمان سے وابستہ رہنے والوں میں شمار کیا جا

سکتا ہے، موصوف کا عقیدہ ہے کہ استاد کا کلام ایمان نہیں پیدا کر سکتا ان کی نظر میں ایمان تک تعقل و تفکر کے ذریعہ رسائی نہیں ہو سکتی، ایمان ایسا نور ہے جو روشنی دیتا ہے اور خداوند عالم لطف کے طور پر اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے مفت عطا کر دیتا ہے۔

مولوی نے بھی صرف عقل سے وابستگی اور برہان پر اعتماد کرنے کو مصنوعی لکڑی کے پیر پر چلنے سے تعبیر کیا ہے اور عقل کو عشق و ایمان سے پست قرار دیا ہے ان کے نزدیک برہان و مفاہیم کے ذریعہ حاصل ہونے والا ایمان ہمہ وقت پاش پاش ہونے کے قریب ہوتا ہے [17]۔

توجہ:

اسلام اور عیسائیت میں ایمان سے وابستگی کے اسباب میں سے ایک سبب عقل سے وابستہ لوگوں کا حد سے تجاوز کرنا اور ایمان کے جوہر کو استدلال و فلسفی مسائل کی پیچیدہ گیوں میں گرفتار کرنا ہے۔

اسی طرح ماورائے طبیعت کے دعووں کے اثبات میں عیسائی فلسفہ کی ناتوانی نے اس فکر کو شدت بخشی ہے۔

حقیقت میں بہت سے عیسائی مفکرین نے یہ چاہا کہ دین و ایمان کے جوہر کو بے روح اور سرد، عقلی و کلامی بحثوں سے نجات دیں [18]۔

حواشی

[1] پل تیلیخ، پویائی ایمان، ترجمہ حسین نوروزی، ص 16-17 انتشارات حکمت، تہران 1375 ہ۔ش۔

[2] طباطبایی، سید محمد حسین، ترجمہ، تفسیر المیزان، ج 18، ص 411-412، بنیاد علمی و فکری علامہ طباطبایی، 1363 ہش.

[3] مانند سورہ والعصر: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

[4] ملاحظہ ہو: مقالات الاسلامیین، ابوالحسن اشعری، ج 1، ص 347، مصر، 1969م؛ اللمع، ص 75، چاپ مدینہ، 1975م؛ تفتازانی، شرح المقاصد، ج2، ص 184، چاپ عثمانی، 1305ہق، بہ نقل از محمد مجتہد شبستری، ایمان وآزادی، ص 12، طرح نو، تہران، سوم 79ش.

[5] معتزلہ کے عقائد کے بارے میں ملاحظہ ہو: احمد امین، فخر الاسلام وضحیٰ الاسلام مبحث معتزلہ۔

[6] شہید ثانی، حقائق الایمان، ص 16، 17، 18.

[7] صدر الدین، محمد شیرازی، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیہ الاربعۃ، ج6، ص 7، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، چہارم، 1990م.

[8] خلاصہ ی شرح التعریف، از متون عرفانی قرن پنجم، ص 227، انتشارات بنیاد فرہنگ ایران.

[9] ایان باربور، علم و دین، ترجمہ، بہاء الدین خرمشاہی، ص 257، مرکز نشر دانشگاہی تہران، 62.

[10] ایضاً، ص 259

(A Theological Work book of the bible، cd،Alam Riehardson (pb 1951، SCM press،london

[11] ایضاً، ص 260.

[12] بحث ایمان گرایی، اقتباس از کتاب فرہنگ واژہہا نوشتہ ی عبدالرسول بیات و دیگران.

[13] ایضاً

[14] ایضاً

[15] ایضاً

[16] ایضاً

[17] ایضاً

[18] ایضاً

جنت میں کون لوگ جائیں گے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی متعدد آیتوں کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ جنت خداوند عالم کا حتمی وعدہ ہے جو متقی، مومن اور خدا اور رسولؐ کے فرمان کے پوری طرح مطیع و فرماں بردار افراد کو نصیب ہوگی، ایسا شخص حقیقت میں سعادت مند اور خوشبخت ہے، اور کامیاب لوگوں میں شمار ہوگا۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستورات کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرامین میں ولی امر کی اطاعت، معرفت امام اور اہل بیتؑ کے حق کی ادائیگی بھی ہے۔ بلا شک وشبہ جو لوگ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن اور اہل بیتؑ پر دل و زبان سے اعتقاد نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی اطاعت کرتے ہیں وہ حقیقی مومن نہیں ہیں اور خدا کا یہ وعدہ (جنت) ان کو نصیب نہ ہوگا؛ اس لئے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ [سورہ بروج:11]

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے ان کے لئے جنت ہے جس میں نہریں جاری ہیں حقیقت میں جنت اور جہنم عقیدہ وعمل کی وہی تصویر ہے جس کے ہمراہ ہم نے دنیا میں زندگی بسر کی ہے۔

اور قرآن کی تعبیر میں ہے:

اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ ۟ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا ؕ]

اگر اچھائی انجام دی تو بھی اپنے ہی لئے اور اگر برائی کی تو بھی اپنے ہی لئے

امامؑ اور اہل بیتؑ کی مکمل پیروی کرنا ان سے محبت کے دعوے سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے اور اس بات کو صرف شیعہ ہی نہیں کہتے۔ معرفت امام کے ہی ذریعہ جنت میں جانے کا راز ان کلیدی، مفاہیم کی شناخت میں پنہاں ہے جیسے امام کی معنی، امام کی اطاعت کا واجب ہونا، امام کی ضرورت، سعادت و کامرانی کی شناخت میں امام کی ضرورت وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص حقیقت کو نہ پہنچ سکا ہو اور خود اس نے حقیقت کی جستجو میں کوتاہی نہ کی ہو اور مقصر بھی نہ ہو تو وہ جہنم کا مستحق نہیں ہے؛ اس لئے کہ جہنم گنہکاروں کی جگہ ہے، ان لوگوں کہ جگہ نہیں ہے جو حق اور حقیقت کی پہچان نہ ہونے کے سبب اس تک نہ پہنچ سکے ہوں۔

تفصیلی جواب

جنت خدا کا پکا وعدہ ہے [1] لیکن یہ وعدہ کے نصیب ہوگا؛ جنتیوں کے متعلق نازل ہونے والی تمام آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ [2]

جنت میں جانے کی ایک شرط ہے وہ ہے مومن ہونا، یہ کہ مومن کون ہے؟ کیا زبان سے کلمہ شہادتین پڑھنا، ایمان کے تحقیق اور مومنین کی فہرست میں داخلہ کے لئے کافی ہے؟

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ [3]

جنت میں جانے والے مومن وہ شخص ہوگا جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے؛ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کس طرح ہوتی ہے؟ اس سلسلہ میں موجود مختلف آیتوں سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس اطاعت میں دو میدان اور حصہ ہے: عقیدتی و عملی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ [4]

جو شخص ایماندار ہے اور عمل صالح انجام دیتا ہے وہ جنتی ہے۔

لہٰذا جب تک ہم رسولؐ کی اطاعت کرنے والے نہ ہوں گے مطیع نہیں ہیں۔

اور اطاعت بھی قلبی اور اعتقادی ہونے کے ساتھ ساتھ عملی بھی ہونی چاہئے اگر خدا یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی ایک حکم پر ہمارا عقیدہ یا عمل نہ ہو تو ہم پوری طرح اطاعت کرنے والے نہیں ہو سکتے!

ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ

قرآن مجید کی نگاہ میں ان دونوں (ایمان اور عمل صالح) کا نتیجہ تقویٰ ہے اور متقی حضرات ہی جنتی ہیں:

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ [5]

گذشتہ مطالب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سعادت مندی کا جوہر تقویٰ اور تقویٰ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام فرامین کی کاملاً اطاعت کا نام ہے۔

اگر چہ تقویٰ کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں لیکن اس کا سب سے کم درجہ واجبات کو انجام دینا اور گناہوں سے پرہیز ہے اسی لئے ہمیں چاہئے کہ ایک تو واجبات اور احکام کی اچھی طرح اطاعت و پیروی کریں۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق آپ کے بعد امامؑ و جانشین کی معرفت اور انہیں پہنچاننا ضروری ہے [6]، بلاشبہ جو لوگ امام پر قلبی و زبانی عقیدہ نہیں رکھتے یا عملی طور پر امامت کی اطاعت نہیں کرتے ہیں وہ مومن یا عمل صالح انجام دینے والے نہیں ہو سکتے اور نہ ہی تقوے کے درجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

نکتہ:

سورہ نساء آیت نمبر 59 کے مطابق ولی امر کی اطاعت واجب ہے یہاں تک کی ولی امر کی اطاعت خدا کی اطاعت کے برابر ہے لیکن یہ بھی یاد دہانی ضروری ہے کہ ولی امر کو معصوم ہونا چاہئے اور جو بھی شخص حاکم بن جائے وہ ولی امر نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر ولی امر معصوم نہ ہوگا تو اس بات کا امکان ہے کہ اس کا حکم خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف ہو ایسی صورت میں خدا کی اطاعت اور ولی امر کی اطاعت کا حکم دو مخالف اور متضاد چیزوں کے ایک جگہ جمع ہونے پر تمام ہوگا جو کہ یقیناً محال ہے۔

اب جب کہ ہم سعادت اور امامت پر اعتقاد کی تاثیر کو جان گئے تو اب انسان کی فردی یا اجتماعی زندگی کی سعادت اور جنتی یا جہنمی ہونے میں امامت کے طریقہ اور اثرات کی توضیح کریں گے[7]۔

کامیابی اور امام پر اعتقاد کا کردار

اب ہم گذشتہ مطالب کی تاکید کرتے ہوئے دنیا و آخرت میں، کامیابی و سعادتمندی کے مفہوم کی تحقیق کریں گے، نیز کامیابی کے لئے امام و امامت پر اعتقاد کے کردار سے واقف ہوں گے۔

الف: کامیابی کا مفہوم:

ہر شخص کامیابی اور خوشبختی ہے الگ الگ تعریف کرتا ہے لیکن لگتا یہ ہے کہ یہ اختلاف حقیقت کی جستجو کرنے والوں کے حق میں نہ ہو کیونکہ:

[حرم در پیش وحرامی در پس، اگر خفتی مردی واگر رفتی بردی]

یعنی کعبہ آگے ہے اور لوٹنے والے پیچھے ہیں۔ اگر سوئے تو مارے جاؤ گے اور اگر چلتے

رہے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔

لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ اس کی واقعی تفسیر خدا سے طلب کریں جس نے دو گروہوں کامیاب اور ناکام انسان کی توصیف کی ہے۔ جب وہ حضرت ابراہیمؑ کی توصیف کرنا چاہتا ہے تو اس طرح توصیف کرتا ہے: [وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿٨٣﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٤﴾][8] اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ان (حضرت نوحؑ) کے شیعوں اور پیروکاروں میں سے تھے (اس کی دلیل یہ ہے کہ) جب وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گئے تو قلب سلیم اور پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوگا [9]۔

قلب سلیم کی تاکید سے پتا چلتا ہے کہ کامیاب، سعادتمند، وہ شخص ہے جو اس طرح مذہبی زندگی بسر کر کے خداوند عالم سے ملاقات کے موقع پر قلب سلیم کے ساتھ ہو۔

اور مزہ کی بات تو یہ ہے کہ سورہ شعراء آیت نمبر 89 میں یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے [وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٩٠﴾] روز قیامت متقیوں کی خدمت میں جنت سج دھج کر ان کے پاس آئے گی اس آیت کا یہ پیغام ہے کہ قلب سلیم کا نتیجہ تقویٰ ہے اور متقین کا انعام جنت ہے۔

نتیجاً: سعادت، کامیابی اور کامرانی قلب سلیم کا مالک ہونے کی کوشش میں میسر ہے۔ حقیقی خوشبخت انسان، صاحب قلب سلیم ہے اور سعادت و کامیابی، قلب کی سلامتی سے وابستہ ہے۔

ب۔ سعادتمندی کے لئے امامت پر اعتقاد کا کردار:

اہل سنت کے متعدد مصنفوں اور راویوں نے یہ اہم روایت نقل کی ہے، جس کا کچھ حصہ اس طرح ہے:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: جناب موسیٰؑ کی امت میں 71 فرقے

ہوئے تھے جن میں صرف ایک فرقہ نجات پانے والا تھا اور بقیہ فرقے جہنمی ہو گئے تھے، اور میری امت میں بھی 73 فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک کو نجات ملے گی بقیہ فرقے جہنم میں جائیں گے، حضرت علیؑ نے سوال کیا نجات پانے والا فرقہ کون ہے؟ فرمایا: وہ لوگ جو تمہارے اور تمہارے دوستوں کے راستہ پر چلیں کے اور اسی سے متمسک رہیں گے [10]۔

بریدہ اسلمی جو اہل سنت کے یہاں اصحاب رسول میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں آنحضرتؐ سے نقل کرتے ہیں کہ: [اهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ] سے مراد وہی محمد وآل محمد علیہم السلام ہیں [11]

رسول خداؐ فرماتے ہیں: جو شخص پل صراط سے سے تیز ہوا کی مانند تیزی سے گزرنا چاہتا ہے اور حساب وکتاب کے بغیر جنت میں جانا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ یقیناً وہ میرے ولی، وصی، اور خلیفہ علی ابن ابی طالب کی ولایت قبول کرے۔

اور جو شخص جہنم میں جانا چاہتا ہے وہ ان (علی) کی ولایت کو ترک کرے میرے پروردگار کے جلال وعزت کی قسم کہ وہی باب الٰہی ہے وہ باب کہ جس کے سوا کسی اور باب سے خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا بلا شبہ وہ صراط مستقیم ہیں: یہ وہی ہیں جن کی ولایت کے سلسلہ میں خداند عالم روز قیامت لوگوں سے پوچھے گا۔[12]۔

کن لوگوں کے اعمال قابل قبول ہیں؟

ولایت، عبادت قبول ہونے کی شرط ہے! اہل سنت کی نقل کردہ متعدد روایات کے مطابق خداوند عالم کے نزدیک لوگوں کے اعمال کی قولیت کی بنیادی شرط لوگوں کا امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی ولایت کو قبول کرنا اور ان کی تعظیم کرنا ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھنا عبادت ہے ان کا ذکر عبادت ہے اور کسی بھی شخص کا ایمان ان سے دوستی اور ان کے دشمنوں سے بیزاری کے بغیر مقبول نہیں ہوگا [13]۔

اس روایت سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ اصل میں ایمان کی قبولیت کی شرط تولاّ اور تبریٰ ہے۔

علمائے اہل سنت نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اے علیؑ! اگر کوئی شخص حضرت نوحؑ کی عمر کے برابر خدا کی عبادت کرے، احد کی پہاڑی کے برابر اس کے پاس سونا ہو اور وہ اسے را خدا میں خرچ کرے، اس کی عمر اتنی طولانی ہو کہ ستر مرتبہ حج کرے، اور پھر صفا و مروہ کے درمیان شہید ہوجائے لیکن (اے علیؑ) تمہاری ولایت اس کے دل میں نہ ہوتو وہ جنت کی بو بھی نہیں سونگھ سکتا اور کسی بھی حال میں جنت نہیں جا سکتا ہے [14]۔

لیکن غیر شیعہ جہنم میں جائیں گے یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کی طرف ہم ذیل میں اجمالی طور سے اشارہ کرتے ہیں:

دین اسلام پر ایمان نہ لانے والے لوگ دو قسم کے ہیں:

1۔ وہ گروہ جو اصطلاح میں جاہل مقصر اور کافر کے نام سے معروف ہے؛ یعنی اسلام تک پہنچا، وہ اس کی حقیقت سے واقف ہوئے لیکن سرکشی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں، یہ گروہ عذاب کا مستحق ہے اور ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلے گا۔

2۔ وہ گروہ جو جاہل قاصر ہے نام سے معروف ہے یعنی اسلام اور اسلام کا پیغام اس تک نہیں پہنچا یا بہت ناقص اور غیر حقیقی اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اس قسم کا اسلام جسے ہندوستان، چین کے ادیان یا زیادہ سے زیادہ یہودی، عیسائی ادیان کے برابر جانا جاتا ہے ایسے لوگ اپنے دین و مذہب میں سچے ہونے کی بنیاد پر نجات والے ہوں گے۔

اسلام کی نظر میں ایسے افراد اگر اپنے دین و مذہب (جو کہ فطرت پر مبنی ہے) میں سچے ہوں مثال کے طور پر جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں اور انسانیت کے خلاف کام انجام نہ دیں تو اہل نجات ہیں اور رحمت الٰہی کے حق دار ہیں یہی مطلب ان کے لئے صادق ہے جن کے سامنے تشیع کی حقیقت واضح و روشن نہیں ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ ہر وہ شخص جس تک حقیقت نہ پہنچی ہو اور اس نے بھی حق کی تلاش میں کوتاہی نہ کی ہو اور مقصر نہ ہو جہنم کا مستحق نہیں ہے؛ اس لئے کہ جہنم گنہگاروں کی جگہ ہے، نہ کہ ان لوگوں کی جو حقیقت کو پہچان نہ سکے ہوں اور اس تک ان کی رسائی نہ ہوئی ہو۔

حواشی

[1] مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ سورہ محمد۔ 15 [2] سورہ توبہ۔ 72

[3] سورہ نساء۔ 13 [4] سورہ بروج۔ 11 [5] سورہ آل عمران۔ 15

[6] اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ○ ساء۔ 59، قالصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ سورہ شوریٰ۔ 23 ؛ من كنتُ مولاه فهذا عليٌّ مولاهُ۔ المستدرک علی الصحیحین، ج 3، ص 159

[7] البتہ لوگوں کے لئے امام کی ضرورت کے موضوع پر مزید بحث درکار ہے اس طرح کے مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا اس کی تفصیل کسی اور وقت پیش کریں گے۔

[8] سورہ صافات۔ 83۔ 84 [9] سورہ شعراء۔ 87۔ 89

[10] الاصابۃ فی التمییز الصحابہ، عسقلانی، ج 2، ص 174

[11] رشفۃ الصادی، سید شہاب الدین شافعی، ص 25؛ ینابیع المودۃ، شیخ سلما حنفی، ص 114

[12] شواہد التنزیل، حسکانی، ج 1، ص 59۔ 90

[13] مناقب خوارزمی، 19 و 212؛ کفایۃ الطالب، گنجی شافعی، ص 214

[14] ۔۔۔ ثم لم يوالیك يا علی لم يشم رائحة الجنة ولم يدخلها، مناقب خطیب خوارزمی، مقتل الحسینؑ، خوارزمی، ج 1، ص 37۔

دارالحسرۃ اور یوم الحسرۃ میں کیا فرق ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید و روایات میں دارالحسرۃ کا لفظ استعمال نہیں ہوا، صرف لفظ یوم الحسرۃ (یعنی روز حسرت و افسوس ان چیزوں پر جو ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں)۔قرآن مجید میں ایک مرتبہ اور روایات میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ یوم الحسرۃ کا مطلب قرآن و حدیث میں روز قیامت ہے، اس لئے کہ روز قیامت اہل جنت پہ حسرت کریں گے کہ ہم اس سے بہتر بن کر اس سے بلند درجہ پا سکتے تھے اور دوزخ والے افسوس کریں گے کہ اے کاش ہم گنہگار نہ ہوتے اور جہنمی نہ بنتے۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید میں انسان کی اصلی منزل اور قیامت کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے: الواقعہ، الراجفہ، الطامہ، الصاخہ، الحاقہ، یوم الفصل، یوم النّدم، یوم النشور، یوم الحق، یوم المسئلہ، یوم الحساب، یوم المحاسبہ، یوم التلاق اور یوم الحسرۃ وغیرہ۔ وہ نام ہیں جو قرآن مجید میں قیامت کے بارے میں ذکر ہوئے ہیں۔

حسرت کے معنی: حسرت کے اصلی معنی، آشکار و واضح ہونا ہے [1]۔

کہا گیا ہے کہ چوں کہ روز قیامت میں اسرار و حقائق واضح ہوجائیں گے (وہ دن کے جب انسان کے باطنی راز آشکار ہوں گے)[2] اس لئے اسے روز حسرت کہتے ہیں [3]۔

حسرت دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے منجملہ: پشیمان ہونا (اس چیز پر جو ہاتھ سے کھو بیٹھے) چوں کہ انسان حقائق کے واضح ہونے سے نادم و پشیمان ہوتا ہے اس لئے اس دن کو روز حسرت کہتے ہیں۔ یہ استعمال حقیقت میں مجاز اور لازم معنی ہے اسی طرح کہا گیا ہے کہ حسرت ((ٹھہرنے اور رک جانے)) کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس بیان کے مطابق چونکہ انسان روز قیامت کوئی عمل انجام نہیں دے سکتا اور اس کا کام ختم ہوجائے گا اور قرآن کے لفظوں میں ((اس دن ہر چیز کا خاتمہ ہوجائے گا)) [4] اور ماضی کا جبران نہیں کیا جا سکتا لہٰذا قیامت کو روز حسرت کہا گیا ہے؛ اسی طرح ((تحیّر)) تعجب اور حیرت میں پڑ جانا کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور قیامت کو اس لئے روز حسرت کہا گیا ہے کہ اس دن انسان نئے نئے اور عجیب و غریب مراحل دیکھ کر حیران و پریشان ہوگا۔

لفظ ((دارالحسر ۃ)) اصلی دینی متون، یعنی قرآن و روایات میں استعمال نہیں ہوا ہے لیکن لفظ ((یوم الحسر ۃ)) قرآن مجید اور روایات دونوں میں استعمال ہوا ہے۔

ہم قرآم مجید میں پڑھتے ہیں: اور اے میرے رسولؐ اپنی امت کو روز غم و حسرت سے ڈراؤ کہ جس دن بھی چیزوں کا خاتمہ ہوگا اور لوگ اس دن سے بالکل ہی غافل ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے [5]

علامہ طباطبائی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ((سیاق آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ لوگوں کی حسرت کرنے کا سبب یہ ہے کہ کام اپنے اختتام کو ہوگا اور لوگ اپنے نتیجہ عمل سے دنیا میں واقف نہیں ہوں گے اور وہاں متوجہ ہوں گے کہ نقصان ہوا [6] اور جو کچھ حاصل کر سکتے تھے وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے جو انہوں نے اطاعت الٰہی کے سلسلہ میں کی ہے حسرت کریں گے)) [7]۔

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: ((وائے ہو اس غافل و بے خبر انسان پر جس

کی عمر اس کے خلاف دلیل ہے اور زمانہ نے اس کو بد بخت وشقی بنادیا))[8]۔

آیت کی تفسیر میں شیعہ وسنی منابع میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بہت ہی پیاری حدیثیں نقل ہوئی ہیں، معصومؑ سے حدیث منقول ہے کہ جو بہت خوبصورت تمثیل کے ساتھ آیت کی تفسیر کر رہی ہے، امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا: آپؑ نے فرمایا: ((جب جنتی جنت میں اور دوزخی جہنم میں چلے جائیں گےتو خدا کی طرف سے منادی ندا دے گا ؛ اے جنت والو! اور اے جہنم والو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ موت کس شکل کی ہوتی ہے۔ جواب دیں گے: نہیں، موت کی مثال خاکی رنگ شاخدار جنگلی مینڈھے کی طرح ہے جو جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا ہوکر سب کو آواز دے گا نزدیک آؤ اور موت کا نظارہ کرو تو لوگ نزدیک آئیں گے پھر خدا کے حکم سے حیوان کو ذبح کر کے کہیں گے: جنت والو ہمیشہ جنت میں رہوگے اور تمہیں موت نہیں آئے گی اور اے جہنمیوں ہمیشہ جہنم میں رہوگے اور تمہیں موت نہ آئے گی)) امام نے مزید فرمایا: ((یہ خداوند عالم کے اس قول کے معنی میں ہے کہ اس نے فرمایا ہے: ((انہیں روز حسرت سے ڈراؤ جب تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی جب کہ لوگ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں)) یعنی جنتیوں کا کام ہمیشہ جنت میں رہنے اور دوزخیوں کا کام ہمیشہ جہنم میں رہنے کی صورت میں ختم ہوجائے گا۔[9]

بعض منابع میں اسی حدیث کو جاری رکھتے ہوئے نقل ہوا ہے کہ: اہل بہشت اس قدر خوش ہوں گے کہ اگر وہاں کوئی مرنے والا ہوتا تو خوشی سے مرجاتا اور اہل دوزخ اس طرح فریاد کریں گے کہ اگر کوئی مرنے والا ہوتا توغم سے جان دے دیتا[10]۔

جی ہاں ! اس عالم میں گنہگار بھی حسرت و افسوس کریں گے کہ کیوں نیک اعمال انجام نہیں دیئے ؛ اور نیک افراد بھی حسرت کریں گے کہ اے کاش ! زیادہ سے زیادہ نیک اعمال انجام دیئے ہوتے ،جنتی اس لحظہ افسوس کریں کہ جس میں وہ یاد خدا سے غافل تھے اور

اپنے کو سرزنش کریں گے [11]۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دو افراد روز قیامت دوسروں سے زیادہ حسرت کریں گے۔ ایک وہ شخص جو دنیا میں علم حاصل کرسکتا تھا مگر اس نے حاصل نہ کیا دوسرے وہ عالم جس نے علم حاصل کیا اور اس کے طالبعلموں نے اس علم سے فائدہ اٹھا لیکن خود وہ معلم بے بہرہ رہا اور اس نے اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھایا [12]۔

بہر حال دنیا میں سستی کا نتیجہ آخرت میں حسرت اور افسوس کرنا ہے [13]۔

حواشی

[1] العین، ج 3، ص 134 ولسان العرب، ج 4، ص 189

[2] الطارق۔ 9

[3] روض الجنان وروح الجنان، ج 13، ص 83

[4] مریم۔ 39

[5] مریم، 39 وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾

[6] المیزان، ج 14، ص 51.

[7] التبیان، ج 7، ص 127.

[8] نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ 63، ص 153.

[9] بحار الانوار، ج 8، ص 346۔ اسی سے مشابہ بہ روایت صحیح بخاری، ج 5، ص 236 میں اور دوسرے شیعہ وسنی منابع میں موجود ہیں۔

[10] بحار الانوار ج 8، ص 345.

[11] کنز العمال، ج 1، ح 1806.

[12] نہج الفصاحۃ، ج 1، ص 245.

[13] غرر الحکم، ح 10626.

الٰہی ادیان کا ایک ہی ہونا کیسے ممکن ہے؟

مختصر جواب

اگر دین سے مراد اخلاق، عقائد وضوابط کا وہ مجموعہ ہو جو خداوند عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے اور انبیاء کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا ہے تو ایسی صورت میں کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا میں فرق جزئی احکام میں ہے جو قومی، فردی اور زمان ومکان کے لحاظ سے متغیر ہوتے رہے ہیں۔

اگر دین سے مراد دنیا میں موجود ادیان ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کی دنیا میں متعدد ومختلف دین موجود ہیں، ان متعدد ادیان میں بعض حقائق مشاہدہ کے قابل ہیں لیکن حقیقت اور واقعی توحید کی تصویر فقط دین اسلام میں دیکھی اور پائی جاسکتی ہے۔

تفصیلی جواب

جواب تک رسائی کے لئے مندرجہ ذیل موضوعات کا واضح ہونا ضروری ہے: دین کی حقیقت، دین کے مرحلے اور رکاوٹیں، واقعی دین اسلام مستحکم ہے، شریعتوں اور مذاہب میں اختلاف کے اسباب، قرآن مجید اور آسمانی کتابیں۔

الف: دین کی حقیقت:

دین کے لغوی معنی ؛سراپا تسلیم،خضوع، پیروی، اطاعت، سر تسلیم خم کرنا اور انعام ہے ؛ لیکن دین کے معنی اصطلاح میں اخلاق،عقائد اور قانون وضوابط کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے سماجی اور منظّم کرنے اور ان کی تربیت کی خاطر ہو۔

ب: قرآن مجید میں دین کے معنی:

قرآن مجید کی زبانی دین ومقام پر استعمال ہوا ہے:

1۔غیبی طاقت پر ہر قسم کا عقیدہ، چاہے حق ہو یا باطل:

[لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝٦

2۔خاص ادیان الٰہی:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف

ج: دین کے مرحلے اور سطحیں:

اس بحث میں ہماری توجہ کا مرکز دین کا دوسرے معنی میں استعمال ہونا ہے یعنی خاص الٰہی ادیان جس کے مختلف مرحلے اور سطحیں ہیں:

1۔ دین نفس الامری: انسانوں کی ہدایت اور کامیابی کے لئے جو کچھ اللہ کے علم اور مشیت میں موجود ہے وہ نفس الامری دین ہے۔

2۔ دین رسول: خداوند عالم نے انسان کی ہدایت وکامیابی کے لئے رسولوںؑ کے

ذریعہ جو بھی چیزیں بھیجی ہیں وہ دین مرسل کو تشکیل دیتی ہیں۔

دین نفس الامری ایک ہے:

چونکہ انسان اپنے تمام ظاہری فرق کے باوجود ایک مشترک جوہر کا حامل ہے لہٰذا دین نفس الامری بھی اسی مشترک جوہر پر نگاہ رکھتا ہے۔

دین مرسل متعدد ہیں:

قرآن مجید و تاریخ کے مطابق دنیا کی واقعی تاریخ رسولوںؑ کی تعداد کے برابر دین مرسل کے ہونے پر سچی گواہ ہے، یہاں رسول سے مراد، صاحب شریعت نبیؑ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو [1]۔

3۔ حقیقی دین:

4۔ چونکہ دین انسانی سماج کے منظم کرنے اور اس کی تربیت کی خاطر ہے لہٰذا اس (دین) کے قانون وضوابط کا سماج کی واقعی ضرورت سے ہم آہنگ ہونا، سماج کے بدلتے ہوئے حالات کے مناسب ہونا اور انسان کی طبیعت و جوہر کے مطابق ہونا اس دین کے حق ہونے کا معیار ہے۔

پس جس ذات نے اس دنیا اور انسانوں کو پیدا کیا ہے وہ انسان، دنیا اور اس کے تعلقات سے پوری طرح باخبر تھا، نتیجہ میں اس کا دین انسان کی ہدایت و رہبری کی طاقت رکھتا ہے، اس تمہید سے پتہ چلتا ہے کہ، دین حق کا دین ہے جس کا قانون و ضابطہ، اخلاق اور عقیدہ خداوند عالم کی جانب سے نازل ہوا ہے اور دین باطل وہ دین ہے جو غیر خدا کی طرف سے مقرر ہوا ہو [2]۔

د: اسلام مستحکم دین ہے:

قرآن مجید میں الٰہی دین، اسلام کے عنوان سے بیان ہوا ہے اور اس کے ثبات و دوام پر بہت سی دلیلیں قائم کی گئی ہیں پہلی دلیل جو دین کے ثبات پر قائم ہوئی ہے وہ اس کے فاعلی مبداء پر مبنی ہے یہ دلیل دو آیتوں کو ملانے سے حاصل ہوتی ہے،

پہلی آیت سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے: [إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ قف] [3] یعنی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ تنہا یہی وہ دین ہے جسے خداوند عالم کی جانب سے قانونی حیثیت حاصل ہے، دوسری آیت سورہ نحل میں ارشاد ہوتا ہے: [مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ ط] [4] جو تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والا ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ باقی ہے ان دو آیتوں سے جو دلیل تیار ہوتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کے خداوند عالم کے پاس اسلام ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ باقی ہے لہٰذا اسلام باقی ہے دوسری دلیل انسان کی طبیعت پر مبنی ہے جو دین کا قابلی مبداء ہے۔ اس طرح کہ اسلام، انسان کی ترتیب اور اس کی فطرت کو شگفتہ کرنے کی خاطر نازل ہوا ہے اور انسان کی فطرت ایک ثابت اور غیر متغیر امر ہے لہٰذا جو دین انسانی فطرت کی تربیت کی خاطر منظم ہوا ہے وہ بھی ثابت اور مشترک ہوگا۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ط [5]

یعنی (اے رسولؐ) تم اپنا رخ دین حنیف کی طرف کئے رہو یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خداوند عالم کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی وہ تنہا

دین جس کی سفارش تمام اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے اور جو تمام شریعتوں کا متفقہ دین ہے، خداوند عالم اسے اس طرح بیان کرتا ہے: [شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ⑬][6]۔

یعنی خداوند عالم نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس (پر چلنے) کا حکم نوح کو دیا تھا اور اے رسولؑ اسی کی ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں متفرقہ نہ ڈالنا جس دین کی طرف مشرکوں کو بلا رہے ہو وہ ان کو بہت شاق گزرتا ہے، خدا جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کو برگزیدہ (بندہ) کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کر لے اس کی ہدایت کرتا ہے۔

ھ: مذاہب کا منسوخ ہونا اور شریعتوں کا اختلاف:

الٰہی دین کے استحکام اور اتحاد کا نتیجہ یہ ہے کہ الٰہی ادیان کا فرق کبھی بھی اصل دین، جو کہ اسلام ہے، میں نہیں ہے بلکہ فرق شریعت و مذاہب میں ہے اس لئے کہ اصول دین جو وہی توحید، وحی، رسالت، عصمت و امامت، عدالت، برزخ، قیامت اور اسی جیسے دیگر مسائل ہیں وہی عام راستہ ہے جس پر انسان اپنی الٰہی فطرت وطبیعت کی بنیاد پر چلتا ہے لیکن جزئی اور فرعی احکام ہیں جو انسان کی طبیعی و مادی ضرورت کے مناسب اور قومی، فردی، اور زمان و مکان کی مختلف خصوصیت کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں [7]۔

قرآن کریم میں جہاں تک اصول دین کا یا عام راستہ کی بات ہے تو انبیاء نے ایک

دوسرے کی تصدیق کی ہے:

[مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا] [8] قرآن مجید الٰہی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس کے روبرو ہیں اور ان کا محافظ بھی ہے

لیکن جہاں بات جزئیات اور فروع دین کی ہے وہاں تعدد، تبدیلی، تفسیر اور نسخ کی بات کی ہے [لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا] تم میں سے ہر امت کے لئے ایک شریعت اور مخصوص راستہ قرار دیا ہے۔[9]

مختلف شریعتوں کا مختلف راستہ یا مختلف نسخہ ہے جو امت کی استعداد کے مطابق اور اولیاء و انبیاء کے مقام و منصب کی مناسبت سے تشکیل پاتا ہے اور اس کی کثرت کا سبب یا تو اس حقیقت واحد کی مختلف تصویر دکھانا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے سامنے آتی ہے یا انسان کی سمجھ بوجھ کے مطابق اصل اصیل اور رکن وثیق (خدا) کی جانب سے دقیق بیان ہے۔

کیونکہ الٰہی وحی ایک رسی ہے جس کا ایک سرا انسانوں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا خدا کے پاس ہے اور انسان جس قدر اس راستہ پر آگے بڑھے گا اس بلند و برتر ادراک سے شرفیاب ہوگا، اس کے بغیر کہ برتر ادراک پست ادراک کی نفی کرے یا پست ادراک بلند تک پہنچنے میں حائل ہو۔ یہ وہی رسی ہے جس سے متمسک رہنے کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے: [وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا] [10] سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو

اس رسی کے مراحل کا آغاز لوگوں کے درمیان رائج الفاظ سے ہوتا ہے اور کمال، مقام: [ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝٨ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝٩] [11] تک باقی رہتا ہے۔

اسی لئے سب سے کامل انسان خاتم النبیؐ ہیں اپنے ظہور کے ذریعہ اس مقام کے فتح

کرنے کی خوشخبری دی تو شریعتوں کے تعداد، تبدیلی اور نسخ کے مراحل جو کہ اس مقام تک پہنچنے کا راستہ ہیں ختم ہوجاتے ہیں اور پیغمبر کی شریعت کی تبلیغ کے ذریعہ آخری خطاب ہوتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [12]

یعنی آج میں نے تمہارے دین کو کامل اور نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے دین کے عنوان سے قبول کرلیا ہے [13]

و: قرآن مجید اور آسمانی کتابیں:

قرآن مجید کا دوسری آسمانی کتابوں کا ان پر برتری کے ساتھ ساتھ تصدیق کرنا بہت بڑی خدمت ہے جسے قرآن نے ان (کتابوں) کے لئے انجام دیا ہے۔

شیعوں کے نامور فقیہ مرحوم کاشف الغطاء اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: اگر قرآن اور رسول اسلام کا وجود مبارک نہ ہوتا تو عیسائیت اور یہودیت کا نام ونشان بھی نہ ہوتا [14] اس لئے کہ توریت و انجیل جو کہ تحریف شدہ ہیں اور خدا کے یعقوب سے جنگ کرنے کو بیان کرتی ہوں، انبیاء کو شرابی بتاتی ہوں اور پاک دامن خواتین پر تہمت لگاتی ہوں ان میں ہرگز باقی رہنے کی طاقت نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید نے توحید کے عام کرنے کے ساتھ ساتھ انبیاء کے دامن کو بھی اس طرح کی تہمتوں سے پاک کیا اور ابراہیمؑ خلیل اللہ اور دیگر تمام انبیاء کی عزت وعظمت بیان کی۔ جناب مریمؑ عذرا کو طہارت و پاکیزگی کے ساتھ یاد کیا اور ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ [15]۔

یعنی یقیناً خداوند عالم نے (اے مریم) تم کو برگزیدہ کیا اور (تمام گناہوں و برائیوں) سے پاک وصاف رکھا اور سارے عالم کی عورتوں میں سے تم کو منتخب کیا[16]۔

حواشی

[1] مزید مطالعہ اور دین کے مراحل سے واقفیت کے لئے رجوع کریں: مبانی کلامی اجتہاد ہادوی تہرانی، مہدی، ص 383۔389۔

[2] جوادی آملی، عبداللہ، شریعت در آئینہ معرفت، ص 111۔112 با تلخیص۔

[3] سورہ آل عمران۔ 19

[4] سورہ نحل۔ 96

[5] سورہ روم۔ 30

[6] سورہ شوریٰ۔ 13

[7] جوادی آملی، عبداللہ، شریعت در آئینہ معرفت، ص 118، 120 با تلخیص

[8] سورہ مائدہ۔ 48

[9] سورہ مائدہ۔ 48

[10] سورہ آل عمران۔ 103

[11] سورہ نجم۔ 8۔9

[12] سورہ مائدہ۔ 3

[13] جوادی آملی، عبداللہ، شریعت در آئینہ معرفت، ص 118، 120 با تلخیص

[14] کشف الغطاء، کتاب الجہاد، ص 391

[15] سورہ آل عمران۔ 42

[16] جوادی آملی، عبداللہ، شریعت در آئینہ معرفت، ص 122۔123 با تلخیص

فنا کیا ہے اور مقام فنا کیا ہے؟

مختصر جواب

لغت میں فنا نابودی اور نیستی کے معنی ہے۔ اس کے مقابل میں بقا باقی رہنے کے معنی میں ہے۔ مثال کے طور پر خداوند متعال بقا کے ذمرہ میں سے ہے اور دوسری تمام مخلوقات نابودی اور فنا کے زمرہ سے ہیں۔

اصطلاح میں، فنا خود کو نہ دیکھنے اور نہ پانے کے معنی میں ہے۔ البتہ اپنے آپ سے بے خبری کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ انسان خداوند متعال کے حضور میں اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں دیکھتا ہے اور جو کچھ غیر خدا ہے اس سے اپنا دل خالی رکھتا ہے۔

عرفان میں مقام فنا:

منزل و مرتبہ کو مقام کہتے ہیں کہ عارف برسوں کے رنج و تکلیف اور تہذیب نفس کے بعد اس مقام کو حاصل کرتا ہے۔ اس بنا پر کسی چیز کا تغیر اور زوال جو مشکلات سے طے ہوتا ہے، عادتاً اور غالباً وہ چیز آسانی کے ساتھ ہاتھ نہیں آتی ہے اور وہ پائیدار اور باقی رہنے والی ہے۔

فنا کے مقام پر، انسان خود کو اور اپنی بندگی کو، اپنے رجحانات اور تمناؤں کو اور اطراف کی دنیا کو خداوند متعال کے مقابلے میں کچھ نہیں پاتا اور صرف خداوند متعال پر نظر ڈالتا ہے۔ اولیائے الٰہی جس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ حق ہے خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا

واسطہ۔ یہ واسطہ، کبھی وہی اسماء و صفات الٰہی ہیں اور صاحبان سلوک و معرفت کے لئے، یہ نوری پردے بھی ہٹ جاتے ہیں: الٰھی ھب لی کمال الانقطاع الیك۔۔۔ حتی تخرف البصار القلوب حجب النور۔۔۔ بیشک یہ فنا کی آخری منزل ہے، کہ اس کے بعد انسان کلی طور پر محو ہو جاتا ہے اور چہرے سے مکمل اضمحلال مترشح ہوتا ہے۔ یہاں پر انسان حقیقت کے کانوں سے سنتا ہے، حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حقیقت کی زبان سے بولتا ہے۔ یہ مطلب اصل ذات حق تعالیٰ کو نہ جاننے سے کوئی منافات نہیں رکھتا ہے، کیونکہ اصل ذات حق تعالیٰ خود ذات حق کے علاوہ کسی کے لئے معلوم نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

لغت میں فنا کے معنی نیستی اور نابودی ہیں۔ اس کے مقابل میں بقا باقی رہنے اور پائداری کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا ہے اگرچہ اس کے بعض مشتقات استعمال ہوئے ہیں، جیسے:

کلّ من علیھا فان و یبقی وجه ربك۔۔۔

خداوند متعال نے اس آیہ شریفہ میں فنا (فان) کو بقی (یبقیٰ) کے مقابل میں قرار دیا ہے، یعنی خداوند متعال صرف بقا ہے اور دوسری تمام مخلوقات فنا سے متصف ہیں۔

لیکن فنا کے اصطلاحی معنی اور اس کے لغوی معنی یکساں نہیں ہیں۔ اصطلاح میں اس کے معنی اپنے آپ کو نہ دیکھنے اور نہ پانے کے ہیں۔ لیکن اپنے آپ سے بے خبر رہنے کے معنی میں نہیں ہیں، بلکہ انسان خداوند متعال کی بارگاہ میں اپنے آپ کو کچھ نہیں دیکھتا ہے اور صرف خداوند متعال کی فکر میں ہوتا ہے۔

عرفا کی نظر میں فنا کی تعریف:

فنا کی تعریف میں ابوسعید خرّاز کہتے ہیں: فنا، بندے کا بندگی اور بقا کے لحاظ سے فنا ہونا[1]۔ اور جلوہ الٰہی سے بندہ کی بقا ہے۔

قشیری کا اعتقاد ہے کہ: جس کسی پر سلطان حقیقت کا غلبہ حاصل ہو جائے اور وہ عین واثر کے طور پر اغیار میں سے کسی کو نہ دیکھ سکے، اسے کہا جاتا ہے کہ وہ خلق سے فانی ہو کر حق پر باقی رہا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کہتے ہیں: بُرے اوصاف کے زوال کو فنا کہتے ہیں، جیسا کہ اوصاف محدودہ کے وجود کو بقا کہتے ہیں[2]۔

مقامِ فنا:

عرفان میں دو اصطلاحیں پائی جاتی ہیں:

ا۔ مقام

۲۔ حال

مقام اس منزل و مرتبہ کو کہتے ہیں، جسے سالہا سال کی محنت، مشقت، تہذیب اور تلاش و کوشش کے بعد عارف حاصل کرتا ہے۔ اس لئے، اس کا زوال یا اس میں تبدیلی کا رونما ہونا عام طور پر یا غالباً ناممکن ہے۔ بہ الفاظ دیگر عارف کی تدریجی مشقت و محنت اور مسلسل سیر وسلوک اسے زہد و تقویٰ کی راہ میں ایک خاص مقام کا مالک بنا دیتا ہے اور چونکہ یہ مراحل اور منازل بڑی مشقت سے حاصل ہوتے ہیں اس لئے آسانی کے ساتھ نابود نہیں ہوتے۔

لیکن حال، مقام کے برعکس ہے۔ یہ ایک قسم کی کیفیت اور تبدیلی ہے جو مختلف مقامات طے کرنے کے بعد عارف کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ یہ کیفیت اچانک طاری ہو جائے اور ممکن ہے کہ اچانک ختم بھی ہو جائے۔ لہٰذا، حال ایک مستقل اور پائیدار کیفیت نہیں ہے اور مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے[3]۔

فنا کے مقام پر، انسان، حضرت حق کے مقابل میں اپنے آپ اور اپنی بندگی اور دنیا میں اپنے اطراف میں پائے جانے والے رجحانات اور آرزوں کو نہیں دیکھتا ہے اور صرف خداوند متعال پر نظر رکھتا ہے۔

اس طرح فنا کے معنی وہ لغوی معنی نہیں ہیں جن کے مطابق فنا ایک نقص ہوتا ہے، بلکہ یہ کمال کے بلند مراتب میں سے ایک ہے۔ اس لئے عرفا کہتے ہیں: فنا کا نتیجہ حق کے حضور بقا اور پایندگی ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بلندی از آن یافت کر پست شد

درنیستی کوفت تا ہست شد

فنا کے مقام کو پانے کا طریقہ کار:

چونکہ انسان اور خداوند تعالیٰ کے درمیان گناہ اور خود خواہی کے علاوہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے، اس لئے غیر خدا سے تعلق رکھنا حجاب شمار ہوتا ہے اور ظلمت کے یہ پردے حق کی وادی میں پہنچنے کے لئے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی گناہ، پردہ اور تعلق نہ ہو اور انسان کی بنیادی توجہ اپنی ہستی کی طرف ہو جائے، تو اس کے لئے محدود صورت میں حق کے شہود کا امکان ہے اس کے بعد فنا کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

لیکن اس راہ میں بہت سے پڑاؤ اور منزلیں ہوتی ہیں جن پر مفصل بحث کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے، البتہ خدا کے دیدار سے مراد جو شہود اور بقا وغیرہ کے عناوین سے بیان کیا جاتا ہے، وہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے، کیونکہ آیہ شریفہ لا تدرکہ الابصار [4] کی تعبیر کے مطابق اس سے مراد فکری راہیں بھی نہیں ہے اور فکری راہ کو شہود اور لقاء کی راہ نہیں کہا جاتا ہے، بلکہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق اس سے مراد غیر از خدا ہر ایک چیز سے ہاتھ دھونا ہے۔ نیک کام انجام دینا اور خدائے واحد کا شریک ٹھرانے سے پرہیز کرنا ہے، کہ اگر کوئی خدا کا مشاہدہ کر کے مقام فنا تک پہنچنا چاہے، یعنی حق تعالیٰ بلا واسطہ دیکھنا چاہے تو اسے اپنے آپ اور دوسروں سے چشم پوشی کرنا چاہئے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾ [5]

(لہٰذا جو بھی اس کی ملاقات کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کی عبادت میں شریک نہ بنائے)

حضرت موسیٰؑ بھی خداوند متعال کے دیدار کے واقعے میں جب بیہوش ہو جاتے ہیں، تو ہوش میں آنے کے بعد بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: خداوندا؛ فنا ہونے اور ہر قسم کے تعلق سے دوری اختیار کئے بغیر تجھے دیکھا نہیں جا سکتا ہے [6]۔

لیکن یہاں پر جو چیز انتہائی اہمیت کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض صاحبان سیر و سلوک، بلاواسطہ خدا کو دیکھتے ہیں، اس کے کیا معنی ہیں؟ اور اجمالی طور پر ان تعلقات سے مراد کیا ہے؟

اس معنی کی وضاحت میں بہتر ہے کہ امام خمینیؒ کی اس گراں بہا عبارت پر توجہ دی جائے جو انہوں نے کتاب شریف اربعین میں بیان فرمائی ہے، انہوں نے فرمایا ہے:

مکمل تقویٰ حاصل کرنے اور اپنے دل کے تمام رجحانات سے دوری اختیار کرنے، انیت اور انانیت کے درمیان فرق کرنے اور حق و اسماء و صفات حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے اور ذات الٰہی کے عشق میں غرق ہونے اور قلبی چاہتوں سے اجتناب کرنے کے بعد سالک کے لئے صفائے قلب حاصل ہوتی ہے جو اسماء اور سفات الٰہی تجلی کا سبب بن جاتی ہے۔۔۔۔اور سالک کی پاک روح اور حق تعالیٰ کے درمیان سے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ بعض ارباب سلوک کے لئے ممکن ہے کہ نوری حجاب اور اسماء و صفات ہٹا کر اپنے آپ کو صرف خدا سے متعلق پائیں اور اس مشاہدہ میں حق تعالیٰ کے قیوم ہونے اور آپ اپنی ذات کے فنا ہونے کا مشاہدہ کریں [7]۔

اس مفہوم کے بارے میں مناجات شعبانیہ میں بہترین صورت میں اشارہ کیا گیا ہے: الٰهی هب لی کما الانقطاع الیك... حتی تخرق ابصار القلوب حجب النور------[8]

بیشک ممکن ہے انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اس کے اور اس کے معبود کے درمیان حق تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے نور کے علاوہ کوئی چیز حائل نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں پر یہ نوری پردے بھی ہٹ جائیں۔ سالک ان پردوں کو بھی عبور کر لیتا ہے اور کلی طور پر محوتر ہو جاتا ہے تب اس وقت جو کچھ دیکھتا ہے۔ وہ سب حق ہوتا ہے اور جو کچھ سنتا ہے وہ عین حق ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی آنکھوں سے حق کو دیکھتا ہے، اپنے کان سے حق کو سنتا ہے اور زبان سے حق کی بات کرتا ہے اور غیر حق کے بارے میں نابینا ہوتا ہے۔ یہ فنا فی اللہ کی آخری منزل ہے یعنی مکمل طور پر مضمحل ہونا اور مکمل تلاش کی منزل پالینا۔

فنا اور لقاء اللہ کے مقام کے بارے میں جو یہ تمام وضاحتیں پیش کی گئیں ان کے

مطابق جاننا چاہئے کہ اکتناہ ذات ہمیشہ کے لئے ناممکن ہے، یعنی خداوند متعال کی ذات کے بارے میں علم معاد حاصل کرنا حضرت احدیت کے علاوہ کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہے اور فنا کی بحث کی اس قضیہ سے کوئی منافات نہیں ہے۔

حواشی

[1] فنا کے لفظ کو پہلی بار ابوسعید خراز نے عرفانی اصطلاحات میں شامل کیا ہے۔

[2] خرمشاہی، بہاء الدین، حافظ نامہ، انتشارات سروش، ص 975.

[3] سعدی کہتے ہیں:

زمصرش بوی پیراہن شنیدی

ولی در چاہ کنعانش ندیدی

بگفت احوال ما برق جہان است

گہی پیدا و دگر دم نہان است

[4] انعام، 103.

[5] کہف، 110.

[6] جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، ج 7، ص 255 بہ بعد.

[7] امام خمینی، اربعین حدیث، ص 454.

[8] بحارالأنوار، ج 91، ص 98؛ مفاتیح الجنان مناجات شعبانیہ.

کیا قرآن مجید کی نظر میں حکمت اور علم کے درمیان کوئی فرق ہے؟

مختصر جواب

حکمت کے لغوی معنی، حق وحقیقت کے مطابق گفتار و کردار یا علم وعقل یا انسان کو حق کے امر پر واقف کرنے والی چیز کے ذریعہ حق تک پہنچنا ہے۔علم جاننا، کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا اور بہ الفاظ دیگر دانش وآ گاہی ہے۔

قرآن مجید میں حکمت وعلم: لفظ حکمت، قرآن مجید میں متعدد بار دہرایا گیا ہے، اور اس کے معنی ومفہوم کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں۔بعض مفسرین کہتے ہیں کہ: اس سے مراد نبوت ہے۔بعض کہتے ہیں: اس سے مراد شرایع اور حلال وحرام کا علم ہے اور کچھ مفسرین اس کوقرآن مجید کا علم جانتے ہیں، اور بعض نے اسے خدا کے پیغام کی حقیقت تک پہنچنا بیان کیا ہے۔لیکن علامہ طبا طبائیؒ کا قول، جامع اقوال ہے، اس طرح کہ اس کے مصادیق کے طور پر دوسرے اقوال بھی ہو سکتے ہیں۔اور وہ فرماتے ہیں: حکمت کے معنی، عملی صورت کا محکم اور یقینی ہونا ہے۔ چونکہ حکمت استحکام کی علامت اور نا قابل زوال کے معنی میں ہے اور خداوند متعال نے قرآن مجید کو کتاب حکیم کہا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ قرآن مجید وقت پر بات کرتا ہے، اچھی بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ برہان و دلیل بھی پیش

کرتا ہے۔

لفظ علم کو بھی قرآن مجید میں کافی دہرایا گیا ہے اور اس لفظ کو جاننے، اظہار و وضاحت اور دلیل و حجت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مادہ علم اور اس کے مشتقات کے بارے میں دقت نظر سے تحقیق اور تجزیہ کے بعد اس طرح اظہار کیا جا سکتا ہے کہ تمام مخلوقات علم رکھتی ہیں۔ علامہ طباطبائی آیہ شریفہ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ؕ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ: جملہ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔ اس بات کی دلیل ہے کہ مخلوقات کی تسبیح زبان قال کے علم پر مبنی ہے، کیونکہ اگر مخلوقات کی زبان حال اور وجود صانع پر ان کی دلالت مراد ہوتی تو اس ارشاد الٰہی کے کوئی معنی نہیں تھے کہ: تم ان کی تسبیح کو نہیں سنتے ہو؛ اس معنی کی دلیل پیش کرنے والی دوسری آیات بھی موجود ہیں۔

حکمت اور علم میں فرق: حکمت و علم کو کبھی خداوند متعال سے نسبت دی جاتی ہے، کیونکہ خداوند متعال کی حکمت، انتہائی پائیدار اور فضولیات سے پاک مخلوقات کو پیدا کرنا ہے اور یہ پیدا کرنا خداوند متعال کے لامتناہی علم پر مبنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکمت و علم خداوند متعال کی صفات میں سے ہیں، لیکن اگر فعل الٰہی، حکمت، استحکام اور حق پر مبنی ہو اور باطل سے منزہ و پاک ہو، تو اس صورت میں حکمت، خدا کی صفت ہوسکتی ہے۔ بہر حال چونکہ خداوند متعال کی صفات عین اس کی ذات ہیں، اس لئے حقیقت میں ان دو صفتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، لیکن اعتبار کے لحاظ سے فرق ہونا ممکن ہے۔ حکیم و علیم دونوں لفظ پروردگار عالم کی دانائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن حکمت عام طور پر عملی پہلو بیان کرتی ہے، اور علم نظری پہلو کا اظہار کرتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر، علم کی صفت، خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی ہے اور حکیم کی صفت،

حساب و مقصد کے لحاظ سے کائنات کو پیدا کرنے اور قرآن مجید کو نازل کرنے میں استعمال ہوئی ہے جو خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ کبھی ان دو صفتوں کو انسان سے نسبت دی جاتی ہے کہ انسان میں حکمت، مخلوقات کو پہچاننے اور نیک اور پسندیدہ کام انجام دینے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، اور وہ حکیم ہوتا ہے جو اہل معرفت ہو اور گہری سوچ اور عقل سلیم رکھتا ہو۔ امام موسی بن جعفر علیہ السلام نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد، فہم و عقل ہے۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ: حکمت ایک حالت اور ادراک کرنے اور تشخیص کرنے کی ایک خصلت ہے جو ایک ایسے علم پر مبنی ہے جس کی حقیقت کا مالک خداوند متعال ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: خداوند متعال، خود علم ہے کہ اس میں جہالت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ الفاظ دیگر علم کے مختلف مراتب ہیں اس کا عالی ترین مرتبہ ہستی باری تعالی ہے اور انسان کے علاوہ غیر ذوی العقول مخلوقات بھی علم رکھتے ہیں اور تمام مخلوقات اور علم کے درمیان ان کی ظرفیت اور وجود کے مطابق نسبت معین کی جا سکتی ہے، جبکہ اس کے برعکس حکمت صرف ذوی العقول کی خصوصیت اور صفات میں شمار ہوتی ہے۔

تفصیلی جواب

لغوی معنی: حکمت علم و عقل کے ذریعہ حق و حقیقت تک پہنچنا ہے[1]۔ یہ لفظ مادہ حکم سے ہے اور روکنے اور منع کے معنی میں ہے۔ اور اس کے پہلے معنی ہیں حکم دینا جو ظلم کو روکنے کا سبب بن جاتا ہے۔ حکمت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان سے جہالت اور نادانی کو دور کرتی ہے[2]۔ لیکن علم دانست، دانش[3]، ادراک اور کسی چیز کی بنیاد یا حقیقت کو سمجھنے کے معنی میں ہے[4]، اور علم بعض نتائج پر دلالت کرتا ہے جو اشیاء میں پائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ چیزوں کے درمیان تمیز اور تشخیص کی جا سکتی ہے[5]۔

قرآن مجید میں علم وحکمت:

قرآن مجید میں لفظ حکمت بیس بار دہرایا گیا ہے۔ حکمت کی وضاحت اور تفسیر میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں، جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکمت سے مراد نبوت ہے[6]۔ چنانچہ آیہ شریفہ میں آیا ہے: اور داود نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے انہیں ملک اور حکمت (نبوت) عطا کر دی[7]۔

۲۔ اس سے مراد شرائع (حلال وحرام کا علم) ہے[8]۔ اور آیہ شریفہ میں آیا ہے: اور خداوند متعال اس کو کتاب وحکمت (حلال وحرام کا علم) اور توریت و انجیل کی تعلیم دے گا[9]۔

۳۔ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق حکمت سے مراد قرآن مجید کا علم اور ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و موخر وغیرہ سے آگاہی ہے[10]۔ آیہ شریفہ میں آیا ہے کہ: وہ جس کو بھی چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کر دی جائے اسے گویا خیر کثیر عطا کر دیا اور اس بات کو صاحبان عقل کے علاوہ کوئی نہیں سمجھتا[11]۔

۴۔ بعض مفسرین کے قول کے مطابق، اس سے مراد، قول وفعل کے میدان میں خدا کے پیغام کی حقیقت تک پہنچنا ہے[12]۔

۵۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد دین کا وسیع علم ہے[13]۔

۶۔ بعض مفسرین کے اعتقاد کے مطابق اس لفظ کا مفہوم دین کے بارے میں صحیح فہم وادراک ہے[14]۔

۷۔ بعض مفسرین کا یہ اعتقاد ہے کہ حکمت ایک ایسا علم ہے جو نفع و فائدہ سے سرشار اور انسان ساز ہے[15]۔

۸۔ آخر کار مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: حکمت کے معنی، عملی صورت کا محکم و مستحکم ہونا ہے[16]۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ معنی مذکورہ نظریات کا جامع ہے۔ حقیقت میں مذکورہ اقوال اس معنی کے مصادیق ہیں۔ کیونکہ لفظ محکمہ، حکمت اور اس جیسے الفاظ، استحکام کے معنی کی علامتیں ہیں اور اس کے معنی مستحکم اور ناقابل زوال ہونے کے ہیں [17]۔ خداوند متعال نے قرآن مجید کا نام کتاب حکیم رکھا ہے، وہ اس لئے کہ قرآن مجید بر وقت بات کرتا ہے، اچھی بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ دلیل و برہان پیش کرتا ہے۔ جس بات میں برہان نہ ہو وہ مستحکم نہیں ہوتی ہے[18]۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خداوند متعال نے مجھے قرآن مجید کی شکل میں گراں قیمت نعمت عطا کی ہے اور اس کے ذریعہ مجھے حکمت بھی دی ہے، اور جس گھر میں حکمت سے استفادہ نہ کیا جائے وہ کھنڈر ہے، اس لئے علم و دانش کو حاصل کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی اور لاعلمی کی حالت میں مرجاو[19]۔

لفظ علم قرآن مجید میں ۱۵۰ بار دہرایا گیا ہے، لیکن اس کے مشتقات قرآن مجید میں بہت زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بعض اوقات جاننے کے معنی میں آیا ہے: قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ط [20]،

بعض اوقات اظہار اور وضاحت کے معنی میں آیا ہے: ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ﴿١٢﴾ [21]۔

علامہ طباطبائی لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ کے ذیل میں فرماتے ہیں، علم کا مراد فعلی ہے اور یہ کسی شئے کے خدا کے ہاں خاص وجود میں ظہور اور حضور ہے۔ اس معنی میں علم قرآن مجید میں زیادہ استعمال ہوا ہے اور کبھی دلیل و حجت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے[22]۔

مجموعی طور پر جب ہم ان آیات کی جانچ پڑتال اور اس مادہ اور اس کے مشتقات پر بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات صاحب علم ہیں۔ چنانچہ، علامہ طبا

طبائی آیہ شریفہ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ جملہ: لیکن ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہیں اس بات کی بہترین دلیل ہے، مخلوقات کی تسبیح سے مراد، علم اور زبان حال کی بنیاد پر تسبیح ہے، کیونکہ اگر مراد زبان حال مخلوقات اور وجود صانع پر ان کی دلالت ہوتی تو اس کے کوئی معنی نہیں تھے، فرماتے ہیں: تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو[23]۔ اس معنی کی دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں، جیسے: اس دن (زمین) اپنی خبریں بیان کرے گی، کہ تمہارے پروردگار نے اسے اشارہ (وحی) کیا ہے[24]۔ اسی طرح کچھ آیات انسانوں کے بدن کے اعضاء کی گواہی، خدا سے گفتگو کرنے، خدا کی طرف سے جواب دینے پر دلالت کرتی ہیں۔ البتہ قابل توجہ بات ہے کہ علم کے مختلف مراتب ہیں۔

حکمت اور علم میں فرق:

ان دو الفاظ کے درمیان فرق کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم جان لیں کہ حکمت و علم کی واجب الوجود (خدا) سے نسبت دی جاتی ہے[25]۔ کہ قرآن مجید میں خداوند متعال کی توصیف کے طور پر بانوے بار لفظ حکیم اور ایک سو چھپن بار لفظ علیم استعمال ہوا ہے۔ حکیم اور علیم ایک جہت سے خداوند متعال کی صفات ہیں، کیونکہ خدا کی حکمت، یعنی انتہائی استحکام و پائداری کے ساتھ اور فضولیات کے بغیر مخلوقات کو پیدا کرنا، خداوند متعال کے اس لامتناہی علم پر مبنی ہے، جو خداوند متعال کی صفات ذات میں سے ہے۔ اگرچہ حکمت، صفت فعل بھی ہے، کیونکہ فعل بھی حکمت، استحکام اور حق پر مبنی ہے اور باطل سے پاک و منزہ ہے۔ بہرحال چونکہ خداوند متعال کی ذاتی صفات اس کی عین ذات ہیں، اس لئے ان دو کے

درمیان کوئی فرق نہیں ہے، مگر اعتبار کے لحاظ سے، کیونکہ حکیم و علیم دونوں پروردگار عالم کی دانائی کی طرف اشارہ ہیں، لیکن حکمت، عام طور پر عملی پہلو بیان کرتی ہے۔ اور علم نظری پہلو بیان کرتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر علیم خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی کی خبر دیتا ہے اور حکیم کی صفت، جو حساب و مقصد کے لحاظ سے کائنات کو پیدا کرنے اور قرآن مجید کو نازل کرنے میں استعمال ہوئی ہے خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی کی خبر دیتی ہے[26]۔

بعض اوقات ان دو صفتوں کو ممکن الوجود صاحب عقل (انسان) سے نسبت دی جاتی ہے، کہ انسان میں حکمت، مخلوقات کو پہچاننے اور نیک و پسندیدہ کام انجام دینے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے[27]۔ بہ الفاظ دیگر، قدروں اور معیاروں کی معرفت، جس کے ذریعہ انسان کو پہچان لے اور باطل کو ہر صورت میں تشخیص دے حکمت ہے اور یہ وہی چیز ہے، جس کی بعض فلاسفہ نے کمال قوہ نظریہ سے تعبیر کی ہے[28]۔

لہٰذا، حکیم وہ ہے، جو اہل معرفت اور گہرے فہم اور عقل سلیم کا مالک ہو۔ امام موسی بن جعفر علیہ السلام نے ہشام بن حکم سے فرمایا: حکمت سے مراد فہم و عقل ہے[29]۔ نتیجہ کے طور پر حکمت ادراک اور تشخیص کی ایک حالت اور خصوصیت ہے جو علم پر مبنی ہے، جس کی حقیقت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: خداوند متعال بذات خود علم ہے جس میں جہالت کی کوئی گنجائش نہیں ہے[30]۔

یہ وہی حقیقت ہے جو لقمان نے خداوند متعال سے حاصل کی تھی[31]۔

فلاسفہ کی ایک جماعت کا یہ اعتقاد ہے کہ سوچ، مطالعہ اور غور و فکر، علم و دانش کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں، بلکہ انسانی روح کو معقولات قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور جب انسان کی روح معقولات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے تو خالق کائنات کا فیض انسان

کی روح پر برستا ہے[32]۔

اس کے بعد عمل کے مرحلہ میں انسان کے لئے ادراک و تشخیص کی حالت اور خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ پس بہ الفاظ دیگر انسان کا عمل علم کو قبول کرنے کے لئے روح کو آمادہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور علم کو قبول کرنا حق کو باطل سے متمیز کرنے اور معانی و مقاصد کا ادراک کرنے کے لئے انسان میں روحانی حالت پیدا کرنے کا مقدمہ اور سبب بن جاتا ہے۔

آخری نکتہ:

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ علم کے کئی مراتب ہیں، ہستی (باری تعالیٰ) کے عالی ترین مرتبہ کے علاوہ انسان، اور غیر ذوی العقول مخلوقات بھی علم رکھتے ہیں اور عالم ہستی کی تمام مخلوقات اور علم کے درمیان ان کے وجودی تناسب اور ظرفیت کے مطابق نسبت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس حکمت، صرف ذوی العقول کی خصوصیت اور صفت ہے۔

حواشی

[1] مفردات راغب، مادہ حکم.

[2] معجم مقاییس اللغۃ، مادہ حکم.

[3] قرشی، قاموس قرآن، ج 5، ص 32، مادہ حکم.

[4] مفردات راغب، مادہ حکم.

[5] معجم مقاییس اللغۃ، مادہ علم.

[6] مجمع البیان، 10 جلدی، انتشارات: مؤسسہ الأعلمی للمطبوعات، تاریخ: 1415 ھ ق: ج 2، ص 151.

[7] بقرہ، 251.

[8] مجمع البیان، ایضاً، ص 298.

[9] آل عمران، 48.

[10] مجمع البیان، ایضاً، ص 194.

[11] بقرہ، 269.

[12] مجمع البیان، ایضاً.

[13] ایضاً.

[14] ایضاً.

[15] ایضاً.

[16] علامہ طباطبایی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ترجمہ موسوی ہمدانی، ناشر: بنیاد علمی وفکری علامہ طباطبایی، تاریخ 1363، ج 2، ص 351.

[17] جوادی آملی، عبداللّٰہ، قرآن درقرآن (تفسیر موضوعی)، انتشارات اسوہ، ج 1، ص 297.

[18] ایضاً.

[19] سیوطی، الدرالمنثور، ج 1، ص 335.

[20] بقرہ، 6.

[21] کہف، 12.

[22] کہف، 4 و 5.

[23] علامہ طباطبایی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ایضاً، ج 17، ص 609.

[24] زلزال، 5.

[25] بقرہ، 27.

[26] مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج 15، ص 399.

[27] مفردات راغب، مادہ حکم.

[28] نمونہ، ایضاً.

[29] نمونہ، ایضاً، ج 17، ص 37.

[30] عاملی، شیخ حر، الفصول المہمۃ فی اصول الائمۃ، ج 1، ص 228.

[31] لقمان، 12.

[32] نمونہ، ایضاً، ج 16، ص 349.

آیہ شریفہ واذا الوحوش حشرت میں حیوانات سے مراد کیا ہے؟ کیا حیوانات کا بھی آخرت میں حشر اور سوال و جواب ہوگا؟

مختصر جواب

لغت اور اصطلاح میں حشر:

لغت میں، حشر کے معنی جمع کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں، خداوند متعال کے توسط سے قیامت کے دن مخلوقات کو۔۔۔۔ ان سے حساب لینے اور سوال و جواب کرنے کے لئے۔۔۔۔جمع کرنے کے معنی ہیں۔

حیوانات کا حساب وکتاب، (حشرونشر):

اس مسئلہ کے بارے میں کلی طور پر دونظریات پیش کئے گئے ہیں:

۱۔حیوانات کے لئے کسی قسم کا حشر نہیں ہے اور ہر حیوان کا حشر اس کی موت ہے، کیونکہ حیوانات مکلّف نہیں ہیں، جبکہ حساب اور سوال و جواب مکلفین سے مخصوص ہے۔

۲۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حیوانات کا بھی انسانوں کے مانند حساب کتاب ہوگا اور وہ بھی قیامت کے دن محشور ہوں گے، کیونکہ تمام حیوانات شعور رکھتے

ہیں اوران کے شعور کے مطابق ان سے سوال و جواب ہوگا۔

حیوانات کا شعور وعلم:

حیوانات کے شعور وعلم کے بارے میں آیات و روایات کے دلائل کے علاوہ، بہت سے موجودہ سائنسی تجربے بھی اس دعویٰ کی تائید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آیات میں بیان شدہ واقعات جیسے: سلیمانؑ کے لشکر سے چیونٹیوں کے بھاگ جانے کی داستان، ہدہد کا یمن میں سبا کے مقام پر آنا اور سلیمانؑ کے لئے حیرت انگیز خبر لانے کی داستان اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجی پریڈ میں پرندوں کی شرکت وغیرہ حیوانوں میں جبلّت کے علاوہ بلند شعور کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بعض حیوانات کے بارے میں نقل کی گئی روایتیں حیوانات کے لئے مراتب و مقامات بیان کرتی ہیں جو ان کے علم وشعور کی دلیل ہے، ورنہ حیوانوں کو کوئی مقام ومنزلت عطا کرنا معنی ومفہوم نہیں رکھتا ہے۔

امام سجاد علیہ السلام سے ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جو اونٹ سات سال تک صحرائے عرفات میں رہے، وہ بہشتی حیوانات میں سے ہے۔

تجربہ اور سائنس کے لحاظ سے بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عام حیوانات اپنے نفع و نقصان کے بارے میں آگاہ ہیں اور اپنے دوست و دشمن کو پہچانتے ہیں اور خطرے سے بچتے ہیں اور اپنے نفع کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور تربیت پانا اور وہ گوناگوں کام انجام دینا جس پر وہ مامور کئے جاتے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ حیوانات، حیوانی جبلّت کے علاوہ کافی شعور وادراک رکھتے ہیں۔

اس بنا پر جس طرح ادراک وشعور انسان کے لئے حشر اور خدا کی طرف پلٹنے کا معیار ہے، اسی طرح حیوانوں کے لئے بھی حشر اور معاد کا معیار ادراک وشعور ہے۔ حیوانات کے حشر کے قائل لوگ آیہ شریفہ واذا الوحوش حشرت سے استفادہ کر کے کہتے ہیں کہ: اس سے

مراد قیامت کے دن حیوانات کا جمع ہونا ہے اس قول سے اس آیہ شریفہ کو تقویت ملتی ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے: اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو، ہم نے کتاب میں کسی شیئے کے بیان میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اس کے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ یہ آیت حیوانات کی انسانوں سے تشبیہ دیتی ہے، اُمم امثالکم اور اس کے بعد آیت میں آیا ہے ثم الی ربھم یحشرون جو اس بات کی دلیل ہے کہ حیوانات انسانوں کے مانند مرتے ہیں اور دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ اس معنی کی اسلامی روایتوں نے بھی تائید کی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہ حوالہ اہل سنت ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: خداوند متعال ان تمام رینگنے والے جانوروں کو قیامت کے دن محشور کرے گا اور بعض حیوانات سے بعض کا قصاص لے گا، یہاں تک کہ اس سینگ والے حیوان سے بھی قصاص لے گا جس نے کسی بے سینگ والے حیوان کو مارا ہو۔

تفصیلی جواب

حشر کے لغوی اور اصطلاحی معنی:

لغت میں حشر جمع [1] کرنے کے معنی میں ہے اور آیہ شریفہ ذٰلِكَ حَشۡرٌ عَلَيۡنَا يَسِيۡرٌ ﴿۴۴﴾ [2] یہ حشر ہمارے لئے آسان ہے۔ لفظ حشر اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور شرعی اصطلاح میں اس کے معنی: خداوند متعال کا قیامت کے دن مخلوقات کو جمع کرنا ہے تا کہ ان سے سوال و جواب اور محاسبہ کرے۔ اور اللہ سے ڈرو اور یہ یاد رکھو کہ تم سب (ایک دن) اسی کی طرف محشور کئے جاؤ گے [3]۔ وحوش، وحش کی جمع ہے اور اس کے معنی وحشی حیوانات ہیں

جو پالتو حیوانات کے برعکس اور مقابل ہوتے ہیں [4]۔ اور جو حیوان انسان سے انس نہ رکھتا ہو اسے وحشی حیوان کہا جاتا ہے [5]۔

حیوانات کا حساب و کتاب (حشر ونشر):

اس موضوع پر متکلمین اور مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں کا اعتقاد ہے کی چونکہ حساب و کتاب اور سوال و جواب، مکلفین سے مخصوص ہے اور حیوانات مکلف نہیں ہیں، اس لئے حیوانات کے لئے حشر نہیں ہے، اور ہر حیوان کا حشر اس کی موت ہے۔ اس کے برعکس جنات اور انسانوں کو قیامت پر چھوڑا جاتا ہے۔ لیکن اکثر دانشور اس کے قائل ہیں کہ تمام حیوانات شعور رکھتے ہیں اور قیامت کے دن محشور ہوں گے اور ان کے شعور کی بہ نسبت ان سے سوال و جواب ہوگا۔

حیوانات کا علم وشعور:

بہت سی آیات و روایات، حیوانات کے علم وشعور کے بارے میں دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے تجربے اور جدید سائنس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات کے مطابق چیونٹیوں کے حضرت سلیمانؑ کے لشکر سے اپنے آپ کو بچانے کی داستان [6]، ہدہد کے ملک یمن کے علاقہ سبا میں آنے اور حضرت سلیمانؑ کے لئے حیرت انگیز خبریں لانے [7] کی داستان، حضرت سلیمانؑ کی فوجی مشق میں پرندوں کی شرکت [8] اور آپس میں ان کی گفتگو کو حضرت سلیمانؑ کے سننے اور خدا کی طرف سے انہیں پرندوں کی زبان سکھانے پر فخر کرنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے [9]۔

اور یہ سب امور حیوانات کے شعور پر دلالت کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو، یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو[10]۔ علامہ طباطبائی (رح) کے مطابق یہ آیت اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ مخلوقات کی تسبیح سے مراد، علم پر مبنی تسبیح ہے اور یہ تسبیح مخلوقات کی زبان قال ہے نہ کہ زبان حال، کیونکہ اگر زبان حال مراد ہوتی اور ان کی دلالت وجود صانع پر ہوتی، تو اس کے کوئی معنی نہیں تھے کہ ارشاد فرماتا: تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو[11]۔

اس کے علاوہ بعض روایات میں، بعض حیوانات کے لئے کچھ مقامات بیان کئے گئے ہیں، مثلاً اگر کوئی اونٹ تین بار مکہ گیا ہو، وہ اہل بہشت ہے[12]۔

اور امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا ہے: جو اونٹ سات سال تک صحرائے عرفات میں رہے، وہ بہشتی حیوانوں میں سے ہے[13]۔

اس قسم کی روایتیں بھی حیوانات کے ادراک وشعور پر دلالت کرتی ہیں، ورنہ ان کے لئے مقام ومنزلت عطا کرنے کا کوئی معنی ومفہوم نہیں ہوگا اور ہم علم وتجربہ سے بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ عام حیوانات اپنے نفع ونقصان سے آگاہ ہیں، اور اپنے دوست و دشمن کو پہچانتے ہیں اور خطرات سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں اور اپنے فائدہ کی فکر میں ہوتے ہیں اور تربیت حاصل کرتے ہیں اور گونا گوں ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔

حیوانات کا محشور ہونا اور انسان کے محشور ہونے سے اسکی شباہت:

آیات وروایات سے واضح طور پر استفادہ ہوتا ہے کہ حیوانات بھی انسانوں کے

مانند ادراک وشعور رکھتے ہیں، اگر چہ نچلے ہی درجہ پر، اوران کی اپنی سمجھ کے مطابق ہی سہی، اور چونکہ انسان کے محشور ہونے کا معیار یہی ادراک وشعور ہے، اس لئے حیوانات بھی محشور ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے۔ اس سلسلہ میں جن آیات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، ان میں یہی آیہ شریفہ: **واذا الوحش حشرت**[14] ہے کہ کہا گیا ہے: یہ آیت قیامت کے مقدمات اور عالم کے فنا ہونے کی ابتدا کے بارے میں ہے[15]۔

لیکن بہت سے مفسرین کے نزدیک اس آیہ شریفہ [کہ جس میں کہا گیا ہے: اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو۔ ہم نے کتاب میں کسی شے کے بیان میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اس کے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے[16]] کے پیش نظر قیامت کے دن حیوانات کے محشور ہونے کے قول کو تقویت ملتی ہے۔ اگر چہ اس آیت میں حیوانات کی انسانوں سے تشبیہ کے بارے میں آیا ہے کہ امم امثالکم، بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حیوانات، آپ ہی کے مانند خداوند متعال کی مخلوق ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے پروردگار کی قدرت، عظمت اور حکمت کی نشانی اور دلیل ہے[17]۔

بعض دوسرے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ (حیوانات) بھی آپ انسانوں کے مانند کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور سونے جاگنے جیسے، زندگی کے طریقہ کے سلسلہ میں عاقلانہ تدبر کے محتاج ہیں تاکہ ان کے لئے زندگی کی مناسب راہ معین ہو جائے[18]۔

بعض لوگ اس آیت کے جملہ ثم الی ربھم یحشرون کے پیش نظر کہتے ہیں کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ (حیوانات) آپ کے مانند مرتے ہیں اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹائے جائیں گے[19]۔

یہی معنی اسلامی روایتوں کے ذریعہ بھی مورد تائید قرار پاتے ہیں۔ من جملہ حضرت ابوذر (رض) سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ ہمارے سامنے دو بکروں نے ایک دوسرے کو سینگ مارا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کیوں سینگ مارا؟

حاضرین نے عرض کی: نہیں،

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اور عنقریب ہی ان کے درمیان فیصلہ سنا دے گا[20]۔

اہل سنت کی طرف سے ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں فرمایا ہے: خداوند متعال قیامت کے دن ان تمام رینگنے والے جانوروں کو محشور کرے گا اور بعض حیوانات سے بعض کا قصاص لے گا، یہاں تک کہ اس سینگ والے حیوان سے بھی قصاص لے گا جس نے کسی بے سینگ والے حیوان کو سینگ مارا ہو[21]۔

حواشی

[1] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 2، ص 145.

[2] ق، 44.

[3] بقرہ، 203.

[4] قاموس قرآن، ج 7، ص 189.

[5] مفردات راغب، مادہ‌ی وحش.

[6] نحل، 18.

[7] نحل، ۲۱.

[8] نحل، ۱۷.

[9] نحل، ١٦.

[10] اسریٰ، 44.

[11] علامہ طباطبایی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ترجمہ فارسی، موسوی ہمدانی، 2 جلدی، ج 17، ص 609، بنیاد علمی وفکری طباطبائی، 1363.

[12] العروسی الحویزی، تفسیر نور الثقلین، ج 1، ص 715، حدیث 68، مؤسسہ ی مطبوعاتی اسماعیلیان، چ 1373 ہش،.

[13] ایضاً، حدیث 70.

[14] تکویر، 5.

[15] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 26، ص 173 و 174.

[16] انعام، 38.

[17] طبرسی، تفسیر مجمع البیان، دار المعرفۃ، چاپ دوم، 1408 ہق، ج 3 و 4، ص 461.

[18] ایضاً

[19] ایضاً

[20] ایضاً؛ تفسیر نور الثقلین، ہمان، ج 1، ص 715، حدیث 69.

[21] محمد رشید رضا، تفسیر المنار، ایضاً، ج 7، ص 326.

خلقت انسان کا مقصد کیا ہے؟ عقلی دلیل بیان کیجیئے۔ اگر اس کا مقصد کمال ہے، تو اللہ نے انسان کو پہلے ہی سے کامل کیوں پیدا نہیں کیا؟

مختصر جواب

خداوند متعال ایک لامتناہی وجود ہے اور اس میں تمام کمالات پائے جاتے ہیں اور فیض و کرم کو پیدا کرنے والا ہے اور خداوند متعال فیاض ہے۔ اس کے کمال فیاضیت کا تقاضا ہے کہ جو بھی چیز پیدا ہونے کی لیاقت رکھتی ہو، اسے پیدا کرتا ہے۔ پس خداوند متعال نے پیدا کیا، کیونکہ وہ فیاض ہے، یعنی پیدا کرنے کا مقصد اسکی فیاضی میں مضمر ہے۔ چونکہ خداوند متعال کی ذاتی صفات اس کی ذات سے خارج نہیں ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پیدائش کا مقصد، خداوند متعال کی ذات ہے۔

پروردگار عالم نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنایا ہے جس میں دو اندرونی رجحانات یعنی خوبی اور بدی موجود ہیں اور اس کے علاوہ اس کے لئے دو خارجی دعوت کرنے والے یعنی خوبی (انبیاء) اور بدی (شیاطین) مقرر کئے ہیں تاکہ انسان خلقت کے کمال تک پہنچے اور زوال کی پستی سے دوچار ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اگر انسان حیوانی رجحانات اور شیطانی

وسوسوں کے باوجود راہ حق کو طے کرے، تو وہ ملائکہ سے افضل ہوگا، کیونکہ ملائکہ میں حیوانی رجحانات اور شیطانی وسوسوں کا فقدان ہے اور اگر یہ انسان باطل کی راہ کا انتخاب کرے تو حیوان سے پست تر ہوگا، کیونکہ حیوانوں میں انسان کی جیسی معنوی قابلیتیں نہیں پائی جاتی ہیں۔

اگر پروردگار عالم پہلے ہی سے انسان کو اس کے لئے ہر ممکن کمالات کے ساتھ پیدا کرتا تو، یہ اس کے لئے اختیاری کمال شمار نہیں ہوتا اور خداوند متعال نے اس سے پہلے ضروری کمالات کے ساتھ مخلوقات کو پیدا کیا تھا۔ لہٰذا انسان کی خلقت کا مقصد اس وقت متحقق ہوتا ہے جب وہ کمال کی قابلیت رکھتا ہو اور اپنے اختیاری عمل سے اس کمال تک پہنچ سکے۔ کافر اور گناہگار جو اس کمال سے محروم رہ جاتے ہیں، اگر چہ انسان کی پیدائش کے اصلی مقصد خداوند متعال کی تشریعی چاہت۔۔۔کو پورا نہیں کر سکے ہیں، لیکن انسان کے تکوینی مقصد کی مخالفت بھی نہیں کی ہے، کیونکہ خداوند متعال (تکوینی چاہت کے مطابق) چاہتا تھا کہ انسان راہ حق یا باطل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ اگر خداوند متعال، انسان کے لئے گمراہی کی راہ کو منتخب کرنا ناممکن بنا دیتا، تو اس کا ایمان اور اس کی اطاعت دونوں اختیار و ارادہ پر مبنی نہیں ہوتے۔

تفصیلی جواب

جواب کو واضح کرنے کے لئے درج ذیل چند مقدمات کو بیان کرنے کی ضرورت ہے:

الف۔ پیدائش کے بارے میں خداوند متعال کا مقصد:

ا۔ چونکہ خداوند متعال واجب الوجود ہے اور اس کا وجود کسی چیز سے وابستہ نہیں

ہے اس لئے اس میں کسی قسم کی محدودیت اور نقص نہیں ہے بلکہ اس میں تمام کمالات پائے جاتے ہیں۔

۲۔ خداوند متعال کے کمالات میں سے اس کا فیاض اور جواد (سخی) ہونا شامل ہے۔خداوند متعال قرآن مجید میں ارشادفرماتا ہے: آپ کے پروردگار کی عطا کسی پر بند نہیں ہے[1]۔ چونکہ خداوند متعال اپنی طرف سے کسی چیز کو عطا کرنے میں کوئی محدودیت نہیں رکھتا ہے، لہٰذا اگر کہیں پر عطا نہیں کرتا ہے تو عطا کو قبول کرنے والے کی محدودیت کی وجہ سے ہے، نہ کہ عطا کرنے والے کی وجہ سے اور جو بھی چیز عطا ہونے کی قابلیت رکھتی ہو، وہ ضرور عطا ہوتی ہے۔

۳۔ ہر خیر وکمال وجود پر مبنی ہے اور ہر شر ونقص عدم پر مبنی ہے۔مثال کے طور پر علم، خیر و کمال ہے اور جہالت، شر ونقص ہے۔اسی طرح عجز و ناتوانی کے مقابلے میں طاقت، کمال و خیر ہے۔پس معلوم ہوا کہ وجود خیر ہے اور اس کے مقابلے میں ہر قسم کا شر ونقص عدم ہے۔

۴۔ تیسرے مقدمہ کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال کا فیاض اور جواد(سخی) ہونا پیدا کرنے سے متحقق ہوتا ہے۔پس فیاض ہونے کا لازمہ پیدا کرنا ہے۔

بہ الفاظ دیگر، اگر کوئی چیز پیدا کی جانے کی لیاقت رکھتی ہو اور خداوند متعال اسے پیدا نہ کرے، تو وجود کے خیر ہونے کے پیش نظر، یہ پیدا نہ کرنا خیر میں رکاوٹ ہے اور بخل شمار ہوتا ہے اور خداوند متعال کے لئے بخل ناممکن ہے۔ان مقدمات سے ہمیں یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے، اگر سوال کیا جائے کہ خدا کو مخلوق کی پیدائش کے لئے کون سی چیز سبب بنی ہے؟ تو ہم جواب دیتے ہیں اس کا فیاض ہونا پیدائش اور تخلیق کا سبب بنا ہے۔

۵۔ خداوند متعال کی صفات اس کی ذات کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔انسان اور

دوسری چیزوں کی صفات ان کی ذات کے علاوہ ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر سیب کی ایک ذات ہےاور سرخی اور مٹھاس اس کی صفتیں ہیں۔سیب کی یہ سرخی اور مٹھاس اس کی ذات کے علاوہ ہے۔سیب ان صفات کے بجائے کھٹا اور سبز بھی ہوسکتا ہے اوراس کی ذات باقی رہ سکتی ہے۔

خداوند متعال کی ذات اور صفات میں اتحاد کی بحث ایک عمیق کلامی بحث ہے،جس کو آپ علم کلام میں توحید صفاتی کی بحث میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں پر جو چیز ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ ہے خداوند متعال کا فیاض ہونا۔۔۔۔ جو خلقت کے مقصد کی علت ہے۔۔۔۔ خداوند متعال کی عین ذات ہے اور اس کی ذات سے خارج کوئی چیز نہیں ہے۔پس اگر سوال کیا جائے کہ پروردگار عالم نے کیوں پیدا کیا؟ تو ہم جواب میں کہیں گے: کیونکہ وہ خدا ہے۔پس مقصد کی علت درحقیقت خود خداوند متعال ہے۔یہ ہمارے فلسفیوں کی بات ہے، جو کہتے ہیں: خداوند متعال میں مقصد کی علت اور افعال کی علت متحد ہے[2]، اور شاید قرآن مجید کی بعض آیات سے یہی معنی نکالے جا سکتے ہیں[3] اورالیہ یرجع الامر کلھہ تمام کام اس کی طرف پلٹا دیئے جاتے ہیں[4]۔سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ب۔انسان کو پیدا کرنے میں خدا کا مقصد:

جو کچھ بیان ہوا، وہ اصل تخلیق میں فاعل کا مقصد تھا،لیکن ایک خاص مخلوق جیسے انسان کو پیدا کرنے میں فاعل کے مقصد کے لئے ایک خاص نکتہ کی ضرورت ہے۔انسان کے بارے میں یہ نکتہ، وہ خاص کمال ہے جسے خداوند متعال انسان کو پیدا کر کے خلق کرنا چاہتا ہے۔

وضاحت: خداوند متعال کے کمال فیاض ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ہر ممکنہ کمال کو پیدا کرے۔ اس نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے، ملائکہ نام کی ایک مخلوق کو پیدا کیا تھا اور ملائکہ پیدائش کی ابتدا سے ہی تمام ممکنہ کمالات کے حامل تھے۔ یعنی وہ اپنے تمام کمالات کے بالفعل حامل تھے۔ لہٰذا انہیں ہرگز کوئی نیا کمال حاصل نہیں ہوتا ہے اور ان کا وجود تکامل کے مراحل طے نہیں کرتا ہے۔ خداوند متعال نے بہ زبان ملائکہ ارشاد فرمایا ہے: اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقام معین ہے اور ہم اس کی بارگاہ میں صف بستہ کھڑے ہونے والے ہیں اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں [5]۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: اس کے بعد بلند آسمانوں کو پھیلا دیا اور ان کو فرشتوں سے بھر دیا۔ فرشتوں کی ایک جماعت ہمیشہ سجدہ کی حالت میں ہے اور رکوع میں نہیں اور ایک جماعت رکوع کی حالت میں ہے اور قیام میں نہیں اور ان میں سے ایک جماعت صف میں کھڑی ہے اور متفرق نہیں ہوتی اور ایک جماعت مسلسل تسبیح پڑھتی ہے اور نہیں تھکتی [6]۔ وہ (فرشتے) خداوند متعال کی عبادت کرتے ہیں، اور یہ ایک کمال ہے جو خداوند متعال نے انہیں عطا کیا ہے اور ان کے لئے نافرمانی اور مخالفت کرنا ممکن نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہوتا ہے: لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ [7] وہ (فرشتے) کسی بات میں اس پر سبقت نہیں کرتے ہیں اور اس کے احکام پر برابر عمل کرتے رہتے ہیں۔ مزید ارشاد فرمایا: (آگ پر) ملائکہ معین ہوں گے جو سخت مزاج اور تند و تیز ہیں اور خدا کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں [8]۔

خداوند متعال، فیاض ہونے کے پیش نظر ملائکہ کو دیئے گئے کمال کے علاوہ انسان کے لئے ایک برتر کمال کا اضافہ کرنا چاہتا تھا اور وہ انسان کے اختیار کا کمال ہے، یعنی ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا تھا جو اپنے ارادہ و اختیار سے ان سب کمالات کو حاصل کر سکے۔

اس طرح اللہ نے انسان کو پیدا کیا، جو پہلے سے اپنے لائق کمالات کا حامل نہیں ہے، لیکن ایسا ہے کہ ان کمالات تک پہنچ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ جن کمالات کو انسان اپنے ارادہ و اختیار سے حاصل کرے، وہ ملائکہ کو عطا کئے گئے کمالات سے برتر ہیں۔ امیرالمومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا ہے: خداوند متعال نے ملائکہ کو صاحب عقل پیدا کیا اور ان کو شہوت نہیں دی اور حیوانات کو شہوت کے ساتھ پیدا کیا اور انہیں عقل عطا نہیں کی اور بنی آدم کو عقل و شہوت کے ساتھ پیدا کیا۔ پس جس کی عقل شہوت پر غلبہ پائے وہ ملائکہ سے برتر ہوگا اور جس کی شہوت عقل پر غلبہ پائے وہ حیوانات سے بدتر ہوگا[9]۔ مولانا رومی نے بھی اس مطلب کو نظم کی صورت میں یوں پیش کیا ہے:

در حدیث آمد که خلاق مجید خلق عالم را سه گونه آفرید

حدیث میں آیا ہے کہ خالق کائنات نے مخلوقات کو تین صورتوں میں پیدا کیا ہے۔

یک گروه را جمله عقل و علم و جود آن فرشته است و نداند جز سجود

ایک جماعت کو عقل وعلم کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ فرشتے ہیں جو سجدہ کے علاوہ کچھ نہیں جانتے،

نیست اندر عنصرش حرص و ہوی نور مطلق زنده از عشق خدا

ان کے اندر حرص اور نفسانی خواہشات نہیں ہیں، وہ مطلق نور ہیں اور خدا کے عشق پر زندہ ہیں۔

یک گروه دیگر از دانش تہی ہمچو حیوان از علف در فربہی

ایک اور جماعت عقل وعلم سے محروم ہے، جو حیوانات کے مانند گھاس کھا کر موٹی ہوتی ہے،

او نبیند جز که اصطبل و علف از شقاوت غافل است و از شرف

یہ لوگ اصطبل اور گھاس پھوس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے اور شقاوت و شرف سے غافل ہیں۔

وآن سوم ہست آدمیزاد و بشر از فرشتہ نیمی و نیمش ز خر

تیسری قسم کی مخلوق انسان اور بشر ہیں، ان میں نصف فرشتوں اور نصف حیوانات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

نیم خر خود مایل سفلی بود نیم دیگر مایل علوی شود

ان کی حیوانی خصوصیات انہیں پستی اور زوال سے دوچار کرتی ہیں اور ان میں فرشتوں کی خصوصیات انہیں کمال تک پہنچاتی ہیں۔

تا کدامین غالب آید در نبرد زین دوگانہ تا کدامین برد نبرد

دیکھنا ہے کہ اس جنگ میں کون سا عنصر کامیاب ہوتا ہے، یعنی حیوانی خصوصیات غلبہ پاتی ہیں یا فرشتوں کی خصوصیات۔

پس انسان کی پیدائش میں فاعل کا مقصد اور آخری سبب بھی خدا کا فیاض ہونا ہے۔ خداوند متعال کے فیاض ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ممکنہ کمال کی اس قسم کو بھی پیدا کرے، جو ممکنات میں سے سب سے برتر کمال ہے۔

ج۔ خدا نے انسان کو کیوں مکمل پیدا نہ کیا؟

مذکورہ مطلب کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اس وقت حاصل ہوسکتا ہے، جب انسان میں کمال تک پہنچنے کی قابلیت موجود ہو اور اپنے اختیاری عمل

سے اسے حاصل کرلے۔ جبکہ اگر وہ پہلے سے کمال رکھتا ہوتا تو ہرگز وہ اس کے لئے اختیاری کمال شمار نہیں ہوتا اور اس کی پیدائش کا اصلی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔

قابل توجہ بات ہے کہ انسان کے لئے کمال کی راہ میں ایک قدم بھی حاصل کرنا، اختیاری کمال کو حاصل کرنا شمار ہوتا ہے اور اس نے اسی قدر پیدائش کے اصل مقصد کو حاصل کیا ہے۔

د۔ کافر اور گناہگار انسان:

اگر انسان کمال کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے اور اس کی پوری زندگی گناہ وعصیان میں گزر جائے، تب بھی اس نے پیدائش کے مقصد سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے، کیونکہ اس نے اس صورت میں بھی اپنی قابلیتوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔ انسان تنزل کی پست ترین منزل تک پہنچنے کی بھی قابلیت رکھتا ہے، اور پروردگار عالم نے اسے ایسے خلق کیا ہے کہ وہ کمال یا زوال کی راہوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرسکتا ہے پس گناہگار اور کافر انسان بھی خداوند متعال کے تکوینی ارادہ کے خلاف قدم نہیں بڑھاتا ہے۔ بیشک خداوند متعال انسان کے کمال تک پرواز کرنے کو پسند کرتا ہے اور گمراہی کی طرف اس کے تنزل کو پسند نہیں کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، خداوند متعال نے انسان کی پیدائش میں ایک تکوینی اور تشریعی مقصد رکھتا ہے: اس کا تکوینی مقصد یہ ہے، کہ ہر انسان اپنی قابلیت کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔خواہ وہ قابلیت اچھی ہو یا بری۔ اس کا تشریعی مقصد یہ ہے کہ انسان صرف کمال کی راہ میں اپنی قابلیتوں کو عملی جامہ پہنائے۔

اس بیان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ایک مومن انسان، تشریعی مقصد کو حاصل کر

کے تکوینی مقصد کی راہ میں بھی قدم بڑھاتا ہے،لیکن کافر اور گناہگار انسان اگرچہ تشریعی مقصد کو حاصل نہیں کرتا ہے،لیکن پھر بھی تکوینی مقصد کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

نوٹ: موضوع کی اہمیت اوراس سلسلہ میں بہت سی احادیث کی موجودگی کے پیش نظر،مزید بحث وتحقیق کرنے کی گنجائش ہے۔

حواشی

[1] اسراء،20.

[2] ملاخطہ ہو: طباطبائی،محمد حسین،المیز ان،ج 8،ص 44؛ مصباح یزدی،محمد تقی،معارف قرآن،ج 1، ص 154.

[3] بقرہ،210؛ آل عمران،109؛ انفال،44؛ حج،76؛ فاطر،4؛ حدید،5.

[4] ہود،123.

[5] صافات،166 و 164.

[6] نہج البلاغہ،خطبہ ی 1.

[7] انبیاء،27.

[8] تحریم،6.

[9] وسائل الشیعۃ،ج 11،ص 164.

ابلیس کو کیوں آگ سے پیدا کیا گیا ہے؟

جواب

پروردگار عالم حکیم مطلق ہے اور اس کے تمام افعال حکمت کاملہ پر مبنی ہیں۔ اس بنا پر تمام مخلوقات کو خداوند متعال کی مکمل حکمت پر پیدا کیا گیا ہے اور خداوند متعال نے ان کی لیاقت کے مطابق انہیں بہترین صورت و حالت عطا کی ہے[1]۔ شیطان کو آگ سے پیدا کرنا بھی خداوند متعال کی حکمت کے مطابق ہے۔ شیطان، جنّات کے انواع میں سے ایک نوع قسم ہے اور اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا ایک لطیف اور نازک جسم ہے۔
ایک کلی تقسیم بندی کے مطابق اجسام دو قسم کے ہیں:

کثیف اجسام: حیوانات اور انسان، جیسی مخلوقات کے مانند اجسام، جو مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان دو قسموں پر مشتمل اجسام حجم و مقدار کے حامل ہوتے ہیں، لیکن آپس میں بنیادی اختلاف رکھتے ہیں کہ، ان کے اختلافات میں سے ایک یہ ہے کی شیطان، انسان کے لئے قابل دید نہیں ہے، بلکہ اپنی نزاکت و نفاست کی وجہ سے ہر شکل وصورت میں ظاہر ہوسکتا ہے اور جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن انسان، شیطان کے لئے قابل دید ہے اور وہ اپنی حالت و مکان کو فوری طور پر نہیں بدل سکتا ہے، اور اس کی حرکت تدریجی ہے۔

شیطان کو آگ سے پیدا کرنے کی حکمت کو مندرجہ ذیل نکات میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

۱۔شیطان کا امتحان:

شیطان کو آگ سے اور انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ شیطان، چونکہ آگ کو خاک سے برتر جانتا تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو انسان سے برتر سمجھا اور اسی وجہ سے خداوند متعال کے حکم کی نافرمانی کی۔ اس لحاظ سے شیطان کو آگ سے پیدا کرنے کا سب سے اہم فلسفہ اور حکمت، اس کا امتحان لینا تھا کہ، کیا وہ آگ سے پیدا کئے جانے کے سبب مغرور ہوتا ہے یا خداوند متعال کے حکم کی فرمانبرداری کرتا ہے؟ کیونکہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ نہ کرنے اور خدا کے حکم کی نافرمانی کے سلسلہ میں دلیل کے طور پر اسی مطلب کو بیان کیا: اس نے کہا کہ میں ان سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور انہیں خاک سے بنایا ہے[2]۔

۲۔انسان کا امتحان:

شیطان، انسان کا جانی دشمن اور اسے بہکانے والا ہے، وہ انسان کو اعتقادات کے بارے میں شک و شبہ میں ڈالتا ہے اور اس کے اعمال و کردار میں فسق و عصیاں کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مکروفریب کا سرچشمہ ہے، اس طرح کہ باطل، جو کسی حقیقت پر مشتمل نہیں ہوتا ہے، کی حق کے طور پر جلوہ نمائی کرتا ہے۔ اس کا طریقہ کار حیلہ اور فریب ہے اور انسان کے اندر پنہاں راستوں سے نفوذ کر کے اسے گمراہ کرتا ہے۔ شیطان چونکہ جسم نازک رکھتا ہے، اس لئے وہ انسان کے باطن میں نفوذ کر سکتا ہے۔ البتہ اس کا نفوذ کرنا انسان کے اختیار پر مبنی ہے، یعنی خود انسان، شیطان کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے، ورنہ اگر انسان خود نہ چاہے تو شیطان اس میں کسی طرح سے نفوذ نہیں کر سکتا ہے۔

اگرچہ انسان شیطان کو نہیں دیکھتا ہے اور اس کی آنکھوں سے پنہاں ہے، لیکن انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے اور اس قسم کے خطرناک دشمن سے بچنا چاہئے۔ اے اولاد آدم؛ خبردار شیطان تمہیں بھی نہ بہکا دے۔۔۔۔۔۔ وہ اور اس کے قبیلہ والے تمہیں دیکھ رہے ہیں، اس طرح کہ تم انہیں نہیں دیکھ رہے ہو [3]۔ اور یہ انسان کے لئے امتحان ہے کہ اس قسم کے دشمن سے مواجہ ہے۔

حواشی

[1] اگرچہ ہم ان کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے ہیں اور اپنے محدود علم کی وجہ سے بہت سے امور کے فلسفہ کا ادراک نہیں کر سکتے ہیں۔

[2] سورہ اعراف۔ ۱۲

[3] سورہ اعراف۔ ۲۷

قرآن مجید کے الفاظ اور ان کی ترکیب، وحی پر مشتمل ہونے کا ثبوت، شرعی احکام کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید سے تمسک پیدا کرنے میں کس قدر موثر ہے؟

مختصر جواب

اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ: بنیادی طور پر قرآن مجید کے سوروں کی ترتیب کا اجتہاد میں کوئی رول نہیں ہے اور اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کے بارے میں سوروں کی ترتیب کے لحاظ سے کوئی فقہی نکتہ استنباط کیا جائے۔ اور اسی طرح جن آیات کے درمیان معنی کا رابطہ موجود نہ ہو، وہ فقیہ کے اجتہاد میں کوئی اثر نہیں رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایک فقیہ اپنے کلامی مبنیٰ میں ان دو مطالب کے ثابت ہونے کا محتاج نہیں ہے[1]۔

جو چیز فقیہ کے لئے ضروری ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن مجید کا مفہوم، الفاظ، آیات کو تشکیل دینے والے الفاظ اور آپس میں مربوط آیات کے مجموعے، اللہ کی طرف سے ہیں اور وحی پر مشتمل ہیں[2] اور اسے قرآن مجید کی بلاغت کے معجزہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے، کیونکہ بلاغت صرف لفظ تک محدود نہیں ہے، بلکہ لفظ و معنی، دونوں اس میں اثر رکھتے

ہیں۔ بنیادی طور پر صحیح مفہوم معنی اور کلام میں تسلسل کے بغیر فصاحت و بلاغت بے معنی ہے۔

دوسری جانب، قرآن مجید کی آیات کے جدا جدا اور جابجا ہونے کے نتیجہ میں بعض معنی کے نابود ہونے کا امکان۔۔۔۔مثلاً ایک قرینہ و سیاق جو ایک خاص معنی پر دلالت کرتا تھا، آیات کے جابجا ہونے کے نتیجہ میں نابود ہو چکا ہو۔۔۔۔مجتہد کی نظر میں معدوم ہے۔ کیونکہ۔۔۔۔اپنی جگہ پر بیان کئے گئے دلائل کی بناء پر۔۔۔۔قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے۔

بہرحال اگر فقیہ احتمال دے کہ کسی آیت میں کمی بیشی واقع ہوئی ہے، یا آیات میں مقدم موخر ہوا ہے اور یہ تبدیلی معنی پر اثر انداز ثابت ہوئی ہے، تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ: میں ظاہر پر مامور ہوں، کیونکہ اس قسم کا احتمال قرآن مجید کی حجیت ظاہری کو مشکوک کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لحاظ سے عقل یہ قبول نہیں کرتی ہے کہ ممکن ہے قرآن مجید کی آیات یا ان کی ترکیب یا ایک مطلب سے مربوط آیات کا مجموعہ، غیر خدا سے صادر ہوا ہو، کیونکہ اس صورت میں قرآن مجید میں تحریف لازم آئے گی جو صحیح نہیں ہے۔ ان اوصاف کے پیش نظر قرآن مجید کا خداوند متعال کی طرف سے نازل ہونے کو عقل سے استناد کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے اس احتمال کو قبول کرنا کہ قرآن مجید کے الفاظ یا ان کی ترکیب حتی کہ قرآن مجید کے ہم سیاق آیات کے مجموعے غیر خدا سے ہوں، قرآن مجید کو حجیت سے گرا دیتا ہے۔ شاید اخباریوں کی طرف سے ظاہر قرآن کو حجت نہ جاننا، ان کے قرآن میں کمی یا آیات کی جابجائی کا اعتقاد تھا۔ البتہ جو کام انہوں نے کیا ہے، وہ نہ صرف دین کا دفاع نہیں تھا، بلکہ ایک قسم کی پسپائی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ خیال کرتے تھے کہ اگر وہ قرآن مجید کو چھوڑ دیں گے تو انہوں نے دین کی خدمت کی ہے، لیکن انہوں نے اس کام کے ذریعہ دین کی سب سے بڑی سند کو اور درحقیقت تمام دین کو مشکوک بنا دیا ہے[3]۔

اس موضوع کے سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل منابع کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے:

مبانی کلامی اجتہاد، تالیف: ہادوی تہرانی، موسسہ فرھنگی خانہ خرد، قم، طبع اول ۱۳۷۷ ھ

حواشی

[1] مذکورہ کلام کے معنی یہ ہیں کہ یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جمع کیا گیا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اس مطلب کا فقیہ کے کام میں کوئی رول نہیں ہے اور یہ مبانی کلامی اجتہاد میں شمار نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، بہت سے شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ تاریخی دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جمع اور مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم قرآن مجید کے سوروں اور آیتوں کی ترتیب میں ایسے نکات پیدا کر سکیں، جن کا نظم بگڑنے کی صورت میں وہ نکات ختم ہو جائیں، مثال کے طور پر سوروں اور آیات کے درمیان عددی روابط، یا قرآن مجید کے مجموعہ میں ایک خاص تسلسل کو پیدا کر سکیں، تو اس مطلب کو ثابت کرنے کے لئے تاریخی دلائل کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عقل کہتی ہے کہ یہ سب نظم و ترتیب خدا کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں۔

[2] تمام آیات کا آپس میں مربوط ہونے اور وحی پر مشتمل ہونے کو قرینہ سیاقیہ کہتے ہیں، جس پر اختلاف پایا جاتا ہے۔

[3] ہادوی تہرانی، مہدی، مبانی کلامی اجتہاد۔ ص ۵۷۔۵۶

قرآن مجید، خداوند متعال کے آخری نبیؐ کا معجزہ ہے، اس کے اعجاز کی صورتیں کیا ہیں؟

مختصر جواب

قرآن مجید کے معجزہ کے بارے میں تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: لفظی معجزہ، مفہومی معجزہ اور اس کو لانے والے کے لحاظ سے معجزہ۔

ا۔قرآن مجید کا لفظی معجزہ دو حصوں پر مشتمل ہے:

الف: بلاغت کا معجزہ:

قرآن مجید کے بیان کا طریقہ ایسا ہے کہ کسی انسان، حتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کا بھی اس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے دانشوروں نے کہا ہے کہ: پیغمبر(ص) کی احادیث اور قرآن مجید کی باہمی مشابہت کا مغالطہ ہو جانے کے بہانے، احادیث لکھنے پر پابندی لگانے والوں کا کام قابل قبول و لائق توجہ نہیں ہے۔

ب: عددی معجزہ:

آج کل سائنس کی ترقی اور کمپیوٹر سے استفادہ کرنے کے نتیجہ میں معلوم ہوا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کے درمیان ایک ایسا رابطہ موجود ہے کہ انسان کے کلام میں اس قسم کا رابطہ پایا جانا ناممکن ہے۔

۲۔قرآن مجید کے مفہومی معجزہ کو چند قسموں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

الف: قرآن مجید کے بارے میں اختلاف نہ ہونا۔

ب: بعض افراد اور واقعات کے بارے میں غیبی خبریں: یہ غیبی خبریں اور پیشنگوئیاں واقع اور ثابت ہوئی ہیں۔

ج: قرآن مجید کے علوم و معارف: قرآن مجید ایسے علوم و معارف پر مشتمل ہے کہ کم از کم اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا کہ ان پر دسترس پا سکے۔ یہ معارف عرفان، فلسفہ اور عقل وغیرہ کے عمیق نکات پر مشتمل ہیں۔

د: قرآن مجید میں موجود علوم و معارف کو باطل ثابت کرنے میں عجز و ناکامی: بیشک صدیاں گزرنے کے باوجود قرآن مجید کے معارف ابھی بھی اپنی جگہ پر موجود اور باقی ہیں اور ان کو باطل ثابت کرنے میں ہر ایک شخص عجز و ناکامی سے دوچار ہوا ہے۔

۳۔لانے والے کے لحاظ سے قرآن مجید کا معجزہ:

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک امّی تھے، پس یہ کیسے ممکن ہے کہ جزیرۃ العرب میں، جہاں پر لوگ علم و دانش اور تہذیب و تمدن سے بے خبر ہوں، اس قسم کی کتاب کو اپنی طرف سے پیش کر سکیں؟

تفصیلی جواب

قرآن مجید کے معجزہ کے بارے میں مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں [1] جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔قرآن مجید کا لفظی معجزہ

۲۔قرآن مجید کا مفہومی معجزہ

۳۔قرآن مجید کا لانے والے کے لحاظ سے معجزہ

ا۔قرآن مجید کا لفظی معجزہ:

قرآن مجید کا لفظی معجزہ دو صورتوں میں بیان ہوا ہے: بلاغت کا معجزہ اور عددی معجزہ۔قرآن مجید کی بلاغت کا معجزہ یا قرآن مجید کی بلاغت کی بحث قدیم زمانہ سے معروف و مشہور تھی اور تقریباً تمام اسلامی مذاہب کا اسی پر اتفاق ہے۔لیکن بعض لوگوں نے،قرآن مجید کی بلاغت کے معجزہ کو قرآن مجید کے نظم، اسلوب اور اس کے بیان کے طریقہ سے جدا کر کے کہا ہے کہ: قرآن مجید کے معجزوں میں سے ایک اس کی بلاغت کا معجزہ ہے اور دوسرا معجزہ اس کے نظم اور اس کے بیان کا اسلوب ہے۔ اور بعض لوگوں نے قرآن مجید کے اعجاز کو اس کی بلاغت، نظم اور اس کے اسلوب کا مجموعہ جانا ہے[2]۔لیکن حقیقت میں یہ سب کثرت امثال کے باب میں سے ہے اور یہ تمام موارد قرآن مجید کے بیان کے طریقہ سے ارتباط رکھتے ہیں اور اس کی بلاغت کے معجزہ کی طرف پلٹتے ہیں۔

قرآن مجید کے بیان کا طریقہ، ایک ایسا طریقہ ہے کہ کوئی اور تو کیا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس روش اور انداز سے کلام نہیں کر سکتے ہیں۔

وضاحت: تاریخ حدیث کے باب میں اہل سنت دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی احادیث و بیانات کو لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت بھی نقل کرتے ہیں [3]، اس کے بعد انہیں اس سوال سے دوچار ہونا پڑا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث کو لکھنے کی کیوں ممانعت فرمائی ہے؟

اس سوال کے دیئے گئے جوابات میں، ایک جواب، جو اہل سنت میں مشہور ہے، وہ یہ ہے کہ، اس ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ ایسا نہ ہو کہ قرآن، غیر قرآن، یعنی احادیث کے ساتھ مخلوط ہو جائے۔ اہل سنت کے ایک محقق نے علمائے اہل سنت میں مشہور استدلال کو مسترد کر

کے فرمایا ہے: قرآن مجید کی بلاغت کا معجزہ، اس کے دوسرے کسی کلام سے مخلوط ہونے میں رکاوٹ ہے[4]۔ اس کے بعد اس محقق نے، اس اشکال کے بارے میں کہ شاید پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فصاحت و بلاغت کی اس حد میں تھے کہ آپ(ص) قرآن کے مانند فسیح و بلیغ بات کر سکتے تھے، جواب دیا ہے کہ: اس بات کا لازمہ قرآن مجید کی بلاغت کے معجزہ سے انکار ہے[5]۔

بہرحال، اس بات کے پیش نظر کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی احادیث، معمولی نہیں تھیں اور آپ(ص) کا اپنا کلام نہیں تھا، بلکہ آپ(ص) کے بیانات نورانی، الٰہی ہدایت اور عالم غیب کے انکشافات شمار ہوتے تھے اور ملت اسلامیہ کے بہت سے مشکلات کو حل کر سکتے تھے، ان کی تحریر میں لانے کی ممانعت کا مسئلہ اہل سنت پر ایک بنیادی اشکال شمار ہوتا ہے، اس لحاظ سے ماضی سے آج تک شیعہ علماء کے درمیان اس دعویٰ کو غلط سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کبھی احادیث کو لکھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

قرآن مجید کے معجزہ کی دوسری صورت اس کا عددی معجزہ ہے۔ یہ صورت عصر جدید میں پیش کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں کمپیوٹر سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ معجزہ خاص توجہ کا سبب بنا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کا خاص اعداد سے رابطہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ اور حروف کا خاص اعداد سے رابطہ ہرگز انسان کا کام اور کلام نہیں ہوسکتا ہے[6]۔

۲۔قرآن مجید کا مفہومی معجزہ:

قرآن مجید کے مفہومی معجزہ کے بارے میں مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، ان کی

طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف: قرآن مجید کے بارے میں اختلاف کا نہ ہونا:

آیہ شریفہ: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ [7]۔

ب: غیبی خبریں:

قرآن مجید میں بعض افراد یا مستقبل میں رونما ہونے والے بعض واقعات۔ یعنی آیات کے نزول کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں پیشگوئیاں کی گئی ہیں اور بعد میں وہ واقعات اسی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک آیہ شریفہ الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ [8]۔ ہے۔

ج۔ قرآن مجید کے علوم اور معارف:

قرآن مجید میں کچھ ایسے مطالب بیان ہوئے ہیں کہ، کم از کم اُس زمانہ میں کوئی انسان ان کے بارے میں آگاہی پیدا نہیں کرسکتا تھا۔ اور اس وقت تک بھی قرآن مجید کے بلند و عالی علوم و معارف انسان کے لئے نامعلوم ہیں، ایسے علوم و معارف کے بارے میں اکثر جو معلوم ہوا ہے وہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کی مسلسل ہدایات کے نتیجہ میں ہے، اس طرح کہ آج کل موجود احادیث کی قابل توجہ تعداد، اعتقادی روایات، عقلی مباحث، فلسفی و کلامی مسائل اور عرفانی موضوعات پر مشتمل ہے۔ بہرحال، بالفرض اگر کوئی شخص قرآن مجید کے تمام علوم و معارف کو اس وقت شناخت شدہ اور انسان کی پہنچ میں جان بھی لے، پھر بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ماضی میں ایسا نہیں تھا، یہ امر اس سلسلہ میں قرآن مجید کے معجزہ ہونے میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ قابل توجہ بات ہے کہ

قرآن مجید کے اس معجزہ کا ثبوت اس کے لانے والے کے ذریعہ پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ عمیق علوم و معارف اس قدر عظمت والے ہیں کہ اس زمانہ کے دانشوروں کی فکر کے دائرہ سے بالاتر تھے اور کلی طور پر یہ انسان کی فکر نہیں، بلکہ یہ وحی الٰہی کی نشانی اور علامت ہے۔

د۔ قرآن مجید میں بیان شدہ معارف و علوم کی تردید کرنے میں انسان کی عاجزی اور ناتوانی:

صدیاں گزرنے کے بعد اور انسان کے علم و دانش میں کافی ترقی اور علم و ہنر اور تہذیب وتمدن کی دگرگونیوں کے باوجود، قرآن مجید میں بیان شدہ مطالب میں سے کوئی ایک مطلب رد یا منسوخ نہیں ہوا ہے اور یہی امر قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی حقانیت کو ثابت کرتا ہے۔

اس نکتہ کو بیان کرنا مفید ہے کہ اگرچہ۔۔۔منطق و ریاض کے مانند۔۔۔بعض انسانی علوم کی ایک مجموعہ کی صورت میں تدوین کی گئی ہے اور قدیم زمانہ سے ہمیں یہ علوم وراثت میں ملے ہیں، اور منسوخ نہیں ہوئے ہیں، لیکن ہمیں توجہ کرنی چاہئے کہ اولاً: یہ علوم و دانش، ابتدائی واضحات یا فطرت کی صورت میں ہر عقلمند کی فکر میں پنہاں تھے اور جن لوگوں نے ان مسائل کو تدوین کرنے کا اقدام کیا ہے، حقیقت میں وہ جمع کرنے والے تھے، نہ کہ انہیں لانے والے۔ ثانیاً: کلی طور پر جن کتابوں کو انسان تالیف کرتا ہے، وہ ایک خاص علم و موضوع کے بارے میں ہوتی ہیں، جبکہ قرآن مجید کے علوم و معارف کے چہرے سے چمکنے والی خصوصیات میں سے ایک ان علوم کے مباحث کی وسعت ہے اور ایک بات میں دسیوں مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

اس قسم کے گوناگوں علوم کا قرآن مجید میں موجود ہونا بذات خود قرآن مجید کے معجزوں میں سے ایک معجزہ کی صورت ہے۔ بھلا کون انسان ایسا کرسکتا ہے کہ متفاوت علوم

اور مختلف علمی دائروں کو اتنی دقت نظر، استحکام بیان اور وسعت موضوعات کے ساتھ حاصل کر کے مسائل کو اس طرح باہم جوڑ دے کہ اس کلام کے صدر و ذیل میں ایسے نتائج ابھر آئیں جن سے نہ مقصود ضائع ہو، نہ سلسلہ ٹوٹے، نہ کوئی خطا سرزد ہو اور اس طرح صدیوں تک یہ کلام روشن رہے اور ہر قسم کی تردید و تنسیخ سے محفوظ رہے [9]۔

۳۔ قرآن مجید کا، لانے والے کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کے معجزہ کی یہ صورت قدیم زمانہ سے زیر بحث رہی ہے، اور یہ اس مطلب پر مشتمل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک امّی شخص تھے، پس آپ (ص) کیسے علم تہذیب وتمدن سے نا آشنا جزیرۃ العرب کے لوگوں میں اس قسم کی کتاب لانے میں کامیاب ہوئے ہیں [10]؟

قابل ذکر بات ہے کہ معجزہ کی بحث، اگرچہ عام طور پر قرآنی علوم کے مباحث میں بیان کی جاتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک کلامی بحث ہے۔ اس لئے بعض کلامی کتابوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے [11]۔

مزید مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل منابع کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

ہادوی تہرانی، مہدی، مبانی کلامی اجتہاد، موسسہ فرہنگی خانہ خورد، قم، طبع اول، ۱۳۷۷ ھ ش۔

حواشی

[1] ملاحظہ ہو: ثامنی، سید مصطفی، وجوہ اعجاز قرآن (مجموعہ مقالات دومین کنفرانس تحقیقاتی علوم و مفاہیم قرآن کریم، دارالقرآن قم) ص 178-168.

[2] ایضاً، ص 169.

[3] ملاخطہ ہو: محمود ابوریہ، اضواء علی السنۃ المحمدیۃ، ص 42.

[4] ایضاً، ص 46.

[5] ایضاً، ص 47.

[6] اس سلسلہ میں قدر کے عنوان سے ایک سافٹ وئیر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جسے ڈاکٹر سید علی قادری نے مرتب کیا ہے۔

[7] کیا یہ لوگ قرآن (کے معنی) میں غور و فکر نہیں کرتے ہیں کہ اگر غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا۔ (سورہ نساء۔ ۸۲)

[8] روم والے مغلوب ہو گئے، قریب ترین علاقہ میں لیکن یہ مغلوب ہو جانے کے بعد عنقریب پھر غالب ہو جائیں گے، چند سال کے اندر (سورہ روم۔ ۳۔۱)

[9] علامہ طباطبائی سے نقل کیا گیا ہے کہ تمام معارف قرآن کو قرآن مجید کے ہر سورہ سے استخراج کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر سورہ میں تمام معارف موجود ہیں، یعنی یہ تمام معارف مختلف صورتوں میں ایک سو چودہ بار بیان کئے گئے ہیں۔ یہ قرآن مجید کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔

[10] بعض مستشرقین نے اس صورت کے بارے میں کہا ہے کہ: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیم یافتہ تھے اور ادیان گزشتہ کے علماء کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کے پاس سبق پڑھتے تھے۔ آپ (ص) نے۔۔۔۔ نعوذ باللہ۔۔۔ قرآن مجید کو ان اطلاعات کے مطابق لکھا ہے۔ اگر قرآن مجید میں جزیرۃ العرب کے لوگوں کو امی کہا گیا ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ معارف الٰہی سے آگاہ نہیں تھے، نہ اس لئے کہ ان پڑھ تھے۔ جزیرۃ العرب کے لوگوں میں تعلیم یافتہ افراد موجود تھے، حتی کہ کافی معلومات رکھنے والے بھی تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ (ص) ایک امی امت یعنی معارف الٰہی سے نا آشنا امت کے پیغمبر تھے۔ لیکن غیر جانبدار محققین کی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ باتیں بے بنیاد ہیں اور یہ سب توجیہات قرآن مجید کے معجزہ سے انکار کرنے کے لئے ہیں۔ (ملاخطہ ہو: علوم حدیث، تالیف: ڈاکٹر منبحی صالحی، مصطلحہ، ص ۲۔۳)

[11] ہادوی تہرانی، مہدی، مبانی کلامی اجتہاد، ص 51-47.

مختلف تفاسیر کے پیش نظر آیہ شریفہ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ۔۔۔ کا مفہوم کیا ہے؟

مختصر جواب

مختلف تفاسیر کے پیش نظر، مذکورہ آیہ شریفہ کے مفہوم کے بارے میں مجموعاً پانچ قول بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت میں ایک عام، عالمی اور انسانی پیغام ہے اور وہ یہ ہے کہ دین ایک اعتقادی اور قلبی مسئلہ ہے اور اس میں جبر واکراہ ناممکن ہے اور بندہ مختار و صاحب ارادہ ہے۔ یہ قول جبریوں کو مسترد کرنے کی واضح دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ: انسان اسلام یا کفر کو قبول کرنے یا عبادات یا گناہ انجام دینے اور دوسرے تمام افعال میں مجبور ہے۔ اور اس کے علاوہ اس آیت کے بعد والی آیت میں مفوّضہ کے عقیدہ کو بھی مسترد کرنے کی واضح حجت و دلیل موجود ہے، جو کہتے ہیں کہ: انسان کو پیدا کرنے کے بعد تمام امور انسان کے ارادہ واختیار میں قرار دیئے گئے ہیں اور خداوند متعال دور بیٹھ کر قیامت تک انتظار کر رہا ہے۔ کیونکہ آیت کے ذیل اور ما بعد میں ولایت وسنت الٰہی کی وضاحت کی گئی ہے کہ کوئی بھی چیز خدا کی مالکیت اور حکمرانی سے خارج نہیں ہے۔

بہ الفاظ دیگر، انسان کے ایمان لانے میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہونے کے باوجود بھی کوئی چیز خداوند متعال کی مالکیت اور تسلط سے باہر نہیں ہے، بلکہ سنت الٰہی کے تحت جو لوگ کفر و طاغوت سے روگردان ہوئے اور خدا پر ایمان لائے وہ نظام علّت و معلول کے مطابق ایک مستحکم دستاویز سے منسلک ہوئے ہیں اور بعد والی ہدایت اور تاریکی سے روشنی کی طرف بڑھنے کے لئے اپنی راہ ہموار کی ہے اور اس کے برعکس جو لوگ تمام واضح اور آشکار دلائل کے باوجود کفر پر چلتے ہیں، تو اسی سنت الٰہی کی بنیاد پر روشنی سے تاریکی کی طرف ہانکے جاتے ہیں۔ پس، انسان، انتخاب کی قدرت رکھنے کے باوجود نتیجہ اور انتخاب کے ماحصل کے بارے میں کوئی طاقت نہیں رکھتا ہے، بلکہ سنت الٰہی کے تابع ہے۔ نتیجہ کے طور پر مذکورہ دو آیات کے مجموعہ سے ایک اصول نکالا جا سکتا ہے جو ائمہ اطہار علیہم السلام کی زبان پر بھی جاری ہوا ہے کہ:

لا جبر ولا تفویض بل امر بین الامرین۔

تفصیلی جواب

آیہ شریفہ کا مکمل ترجمہ: دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت، گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا وہ اس کی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے اور خدا سمیع بھی ہے اور علیم بھی[1]۔

آیہ شریفہ کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے، مقدمہ کے طور پر چند نکات کا بیان کرنا ضروری ہے:

ا۔ الفاظ کے معانی:

اکراہ کے معنی، کسی کو کوئی کام انجام دینے پر مجبور کیا جانا ہے۔ رشد ہدایت، نجات،

صلاح وکمال[2]، کے معنی میں ہے اور اس کے مقابلے میں غیّ ہلاکت کی راہ پر جانے کے معنی میں ہے[3]۔ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: رشد مطلب کی حقیقت تک پہنچنے کا درمیانی راستہ ہے، یہ غیّ کے مقابلے میں اس کا برعکس ہے، اس بنا پر رشد و غیّ ہدایت و ضلالت کے معنی میں ہیں[4]۔

۲۔ مفسرین کے اقوال:

کلی طور پر لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معنی و مفہوم کے بارے میں مفسرین نے پانچ اقوال پیش کئے ہیں جو بالترتیب حسب ذیل ہیں:

الف: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی جنگ کے بعد اسلام قبول کرے تو یہ نہ کہئے کہ اس نے جبر و اکراہ سے اسلام قبول کیا ہے[5]۔

ب: آیت، اہل کتاب کے بارے میں ہے کہ جزیہ کی ادائیگی منظور کرنے کے بعد تم انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرنا[6]۔

ج: اس آیت سے مراد، تمام کفار ہیں، لیکن اس کے بعد قتال[7] اور جہاد[8] کی آیتوں کے ذریعہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے[9]۔

د: آیت سے مراد، انصار کا ایک معین گروہ تھا[10]۔

چنانچہ آیت کی شان نزول بھی ان کے بارے میں ذکر کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں کئی اور باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک کے مطابق: انصار مسلمانوں میں سے ایک شخص کے پاس ایک سیاہ فام غلام تھا اور وہ اس پر اسلام قبول کرنے کے لئے دباو ڈالتا تھا۔ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

ھ: مفسرین کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ، آیت کسی فرد یا گروہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس میں ایک عالمی اور انسانی پیغام ہے۔

کہا جاتا ہے کہ: دین ایک اعتقادی و قلبی مسئلہ ہے اور اس میں جبر و اکراہ ناممکن ہے اور انسان مختار اور صاحب ارادہ ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسا قول ہے جسے مفسرین، خاص کر عصر جدید کے مفسرین نے بیان کیا ہے[11]۔

ایسا لگتا ہے کہ ان تمام اقوال میں سے، آخری قول تقریباً صحیح ہے۔ پس اس آیہ شریفہ سے اطمینان حاصل کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک اجباری اور غیر ارادی امر نہیں ہے، کیونکہ حقیقت واضح ہے، راہ ہدایت و رشد بھی واضح ہے اور غیّ و ضلالت کی راہ بھی واضح ہے، اور انسان ایمان و کفر کو قبول کرنے میں آزاد اور مختار ہے۔ جو بھی اس راہ کو قبول کرنا چاہے وہ اسے قبول کر سکتا ہے اور جو دوسری راہ کو چننا چاہے وہ اسے چن سکتا ہے۔ بلکہ شاید آیہ شریفہ کے قبل و بعد اور سیاق سے ایک اصل کا استخراج کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کا بنیادی استفادہ علم کلام میں ہے، لیکن دوسرے علوم جیسے سیاست اور اقتصاد وغیرہ میں بھی اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اصل وہی ہے جو ائمہ اطہار علیہم السلام کی زبان سے بیان ہوا ہے، یعنی: لا جبر ولا تفويض بل امر بين الامرين[12]۔ چونکہ پہلی آیت میں توحید کی ایک واضح تصویر پیش کی گئی ہے کہ انسان ایک سالم فطرت اور تھوڑی سی دقت و فکر سے، آسانی کے ساتھ حقیقت کو پا سکتا ہے، لیکن ممکن ہے کج فکر افراد توحید کے بارے میں ہمیشہ غلط تصویر پیش کریں۔ لہٰذا، یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، حقیقت میں ایک کلی اصل پیش کر کے کج فکروں کے لئے راستہ بند کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر آیہ شریفہ جبر کے قائلین کو مسترد کرنے کی ایک واضح دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: انسان، اسلام اور کفر کو قبول کرنے میں یا عبادات اور گناہوں اور دوسرے تمام اعمال میں مجبور ہے۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے[13]، اور خداوند متعال نے کسی پر جبر و اکراہ نہیں کیا ہے دوسری طرف مفوّضہ کہتے ہیں کہ: پیدائش کے بعد تمام امور انسان کے ارادہ و اختیار کے تحت اسے تفویض

کئے گئے ہیں اور خداوند متعال کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے قیامت تک انتظار کر رہا ہے۔ چنانچہ معتزلی مسلک سے تعلق رکھنے والے ابی مسلم اور کفال نے آیہ شریفہ کے بارے میں کہا ہے کہ: خداوند متعال نے ایمان کی بنیاد جبر واکراہ پر نہیں بلکہ انسان کے امکان و اختیار پر رکھی ہے، کیونکہ خداوند متعال نے توحید کے دلائل کو کافی حد تک بیان فرما دیا ہے تا کہ ہر عذر و بہانہ کرنے والے کے لئے ایک قطعی حجت اور حتمی دلیل ہو۔ پس کافر کے لئے اپنے کفر پر باقی رہنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اگر وہ پھر بھی اپنے کفر پر باقی رہے تو صرف اس کے ایمان کے سلسلہ میں جبر واکراہ کا راستہ باقی ہے لیکن یہ آیہ شریفہ (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) کہتی ہے: ان کے ایمان میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہ کرنا، کیونکہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور جبر و اکراہ امتحان و آزمائش کے منافی ہے[14]۔ یہ آیت ان کو مسترد کرنے کے سلسلہ میں ایک واضح دلیل ہے، کیونکہ آیہ شریفہ جبری تفکر کو مسترد کرنے کے بعد، بلا فاصلہ فرماتی ہے: اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے اور خدا سمیع بھی ہے اور علیم بھی۔ اور بعد والی آیت کے پیش نظر، جو ولایت وسنت الٰہی کو بیان کرتی ہے، سے اطمینان پیدا کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی چیز خدا کی مالکیت اور تسلط سے خارج نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر، اس طرح نہیں ہے کہ چونکہ ایمان لانے میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں پایا جاتا ہے، اس لئے وہ خدا کی مالکیت اور تسط سے خارج ہوسکتا ہے، بلکہ سنت الٰہی کے تحت جو لوگ کفر و طاغوت سے روگردانی کریں اور خدا پر ایمان لائیں وہ نظام علت ومعلول کے مطابق ایک مستحکم دستاویز سے منسلک ہوئے ہیں اور بعد والی ہدایت اور تاریکی سے روشنی کی طرف بڑھنے کے لئے اپنے لئے راہ ہموار کی ہے اور اس کے برعکس جو تمام واضح اور آشکار دلائل کے باوجود کفر پر چلیں گے، تو اس سنت الٰہی کی بنیاد پر روشنی سے تاریکی کی طرف ہانکے جائیں گے۔ پس انسان، انتخاب کی قدرت

رکھنے کے باوجود نتیجہ اور انتخاب کے ماحصل کے بارے میں کوئی طاقت نہیں رکھتا ہے، بلکہ سنت الٰہی کے تابع ہے۔

نتیجہ: مذکورہ بیان کے مطابق یہ اصول حاصل ہوتا ہے: لا جبر کہ آیہ شریفہ کی ابتدا میں لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی تعبیر ہے اور ولا تقویض آیہ شریفہ کے ذیل میں فمن یکفر ۔۔۔ کی تعبیر ہے۔ جو ہمارے لئے کام کو آسان کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

حواشی

[1] بقرہ، 256.

[2] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 3، ص 100.

[3] ایضاً، ج 5، ص 131.

[4] علامہ ی طباطبایی، تفسیر المیزان، ج 2، ص 342.

[5] علامہ ی طبرسی، تفسیر مجمع البیان، ج 2، ص 126؛ شیخ ابوالفتح رازی، تفسیر رازی، ج 2، ص 330.

[6] عاملی ابراہیمؒ، تفسیر عاملی، ج 1، ص 515 و 516؛ تفسیر مجمع البیان، ایضاً؛ کشاف، زمخشری، ج 1، ص 487.

[7] توبہ، 5.

[8] توبہ، 73.

[9] مجمع البیان، ایضاً۔ کشاف، ایضاً۔ تفسیر عاملی، ایضاً.

[10] مجمع البیان، ایضاً۔ کشاف، ایضاً۔ تفسیر نمونہ، مکارم شیرازی، ج 2، ص 279 و ص 280

[11] مجمع البیان، ایضاً۔ المیزان، ایضاً۔ نمونہ، ایضاً.

[12] کافی، ج 1، ص 160، باب جبر و قدر.

[13] طیب، سید عبدالحسین، اطیب البیان در تفسیر قرآن، ج 3، ص 18.

[14] فخر رازی، تفسیر کبیر، 11 جلدی، ج 3، ص 15.

اسلام میں مرتد کو کیوں قتل کیا جاتا ہے؟ کیا یہ کام عقیدہ کی آزادی کے خلاف نہیں ہے؟

مختصر جواب

ارتداد، دین سے خارج ہونے کا وسیلہ اور اظہار ہے، اور اکثر دوسروں کی تبلیغ کی وجہ سے یہ (دین سے خارج ہونا) انجام پاتا ہے۔ مرتد کی سزا اس شخص کو نہیں دی جاسکتی ہے، جو دین سے خارج ہو چکا ہے، لیکن اس کا دوسروں کے سامنے اعتراف و اظہار نہ کیا ہو۔ مرتد کی سزا تو اسے اجتماعی گناہ کے سبب دی جاتی ہے نہ کہ اس کے ذاتی عقیدہ کی وجہ سے۔

مرتد، ایک معاشرہ کے دینی جذبات کو تحفظ بخشنے کے عوامی حق کو پامال کرتا ہے اور دین کے معاملے میں ماہر نہ ہونے والے لوگوں کے تدین کو خطرہ سے دوچار کرتا ہے۔ صدر اسلام میں بھی کچھ اسلام دشمنوں نے نقشہ کھینچا تھا کہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے مرتد ہو جائیں تا کہ اس طرح مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کریں (آل عمران، 72)۔

اسلام نے اس خطرہ کو روکنے کے لئے، ارتداد کے لئے سخت سزا رکھی ہے، اگرچہ اس کو ثابت کرنے کے طریقہ کو بھی سخت کیا ہے، اس طرح صدر اسلام میں صرف چند گنے چنے افراد کو ہی یہ سزا ملی ہے۔ اس لحاظ سے، اس سزا کے نفسیاتی اثر نے خود سزا کے مقابلہ میں زیادہ عام لوگوں کے لئے سلامتی کا ماحول فراہم کرنے میں مدد کی ہے۔

تفصیلی جواب

اس سوال کے جواب کی وضاحت کے لئے درج ذیل چند مطالب کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

پہلا مطلب: مرتد کون ہے؟

مرتد وہ ہے جو اسلام کے دائرے سے خارج ہو کر کفر کو اختیار کرے[1]۔ اسلام سے خارج ہونا، اصل دین کے انکار، یا اصول دین (توحید، نبوت اور معاد) میں سے کسی ایک کے انکار سے عمل میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ضروریات دین۔۔۔ جو تمام مسلمانوں کے لئے واضح اور عیاں ہیں۔۔۔ میں سے کسی کا انکار، رسالت کے انکار کا سبب بنے اور انسان اس سبب کی طرف توجہ رکھتا ہو تب بھی ارتداد عمل میں آتا ہے[2]۔

ارتداد دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے: مرتد فطری اور مرتد ملّی:

مرتد فطری، وہ شخص ہے، جس کا نطفہ منعقد ہوتے وقت ماں باپ مسلمان رہے ہوں اور خود بھی بالغ ہونے کے بعد اظہار اسلام کر چکا ہو اور اس کے بعد اسلام سے خارج ہو جائے[3]۔

مرتد ملی، وہ شخص ہے، جس کے نطفے کا انعقاد ہوتے وقت (اس کے) ماں باپ کافر تھے، اور اس نے بالغ ہونے کے بعد اظہار کفر کیا ہو اور اس کے بعد اسلام قبول کرنے کے بعد پھر سے کافر ہو چکا ہو[4]۔

دوسرا مطلب: ادیانِ الٰہی اور اسلام میں مرتد کا حکم:

شیعہ فقہ میں، ارث و زوجیت کے باب میں مرتد کے لئے کچھ شہری قوانین کے احکام ہیں، بظاہر یہ احکام مذکورہ سوال کے دائرہ سے خارج ہیں۔

مرتد کا تعزیری حکم یہ ہے کہ: اگر مرتد فطری مرد ہو تو اسے قتل کیا جاتا ہے اور جج کے

پاس اس کی توبہ قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن اگر مرتد ملی ہوتو، پہلے اسے توبہ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اگر اس نے توبہ کی تو اسے آزاد کیا جاتا ہے، ورنہ قتل کیا جاتا ہے۔ مرتد شدہ عورت، خواہ وہ مرتد فطری ہو یا مرتد ملی، قتل نہیں کی جاتی ہے، بلکہ اسے توبہ کی دعوت دی جاتی ہے، اگر اس نے توبہ کی تو اسے چھوڑ دیا جاتا ہے، ورنہ اسے زندان میں رکھا جاتا ہے[5]۔

اہل سنت کی فقہ میں، رائے مشہور کے مطابق، مرتد کو۔۔۔ اس کی تمام قسموں میں۔۔۔۔ پہلے توبہ کی دعوت دی جاتی ہے، اگر اس نے توبہ کی تو اسے آزاد کیا جاتا ہے، ورنہ قتل کیا جاتا ہے اور مرتد ملی، مرتد فطری مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے[6]۔

اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان الہی میں ارتداد جرم و گناہ شمار ہوتا ہے اور اس کی سزا موت ہے[7]۔

اس بنا پر، کہا جا سکتا ہے کہ تمام ادیان و مذاہب کے مطابق ارتداد جرم و گناہ ہے اور اس کی سزا (شرائط میں اختلاف کے ساتھ) موت ہے[8]۔

تیسرا مطلب: مرتد کی سزا کا فلسفہ:

مرتد کی سزا کا فلسفہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے درج ذیل چند نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ اسلام کے احکام دو حصوں میں، یعنی انفرادی احکام اور اجتماعی احکام میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اجتماعی احکام، اجتماعی مصلحتوں کی بنیاد پر وضع ہوتے ہیں، اور بعض اوقات ان مصلحتوں کو پورا کرنا انسان کی انفرادی آزادی کے ایک حصہ کو محدود کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ نکتہ کسی بھی معاشرہ میں نا قابل انکار ہے۔

۲۔ اگر مرتد نے حق کو جاننے کے لئے پوری کوشش کی ہوتو، وہ اپنے ارتداد میں، خدا کے حضور معذور ہے اور حقیقت میں انفرادی احکام کے دائرہ میں مجرم نہیں ہے[9]۔ لیکن

اگر اس نے حق کو پہچاننے میں کوتاہی کی ہو، تو وہ اپنے انفرادی احکام کے دائرے میں بھی مجرم ہے۔

اگر مرتد، اپنے ارتداد کو معاشرہ تک پھیلائے تو اس کا یہ عمل اجتماعی احکام کے دائرہ میں آتا ہے اراجتماعی احکام کے معیار پیدا ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے وہ مجرم ہے، کیونکہ:

اولاً: اس نے دوسروں کے حقوق کو ضائع کیا ہے، کیونکہ وہ عام لوگوں کے ذہنوں میں شک و شبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ معاشرہ کے عام لوگوں کے ذہنوں میں شبہات کی ترویج، ایمانی جذبے کو کمزور کرنے کا سبب بن جاتی ہے اور چونکہ شبہات کی تحقیق کرنا دین کے علماء اور ماہرین کا کام ہے، اس لئے تمام دیندار۔۔۔ جن میں یہ توانائی نہیں ہوتی ہے۔۔۔حق رکھتے ہیں کہ معاشرہ کی عام فضا، شبہات پیدا ہونے سے محفوظ رہے۔

ثانیاً: اس سے قطع نظر کہ معاشرہ کے ایمانی جذبہ کا تحفظ کرنا لوگوں کا حق ہے، اسلام اسے اجتماعی مصلحتوں میں سے جانتا ہے، لہٰذا اسلام نے شعائر دینی کی تعظیم کے لئے ترغیب دی ہے[10]۔ اور اس کو توڑنے سے منع کیا ہے[11]۔ نتیجہ یہ کہ ارتداد شاید انفرادی حکم کے لحاظ سے جرم نہ ہو، لیکن اجتماعی حکم کے لحاظ سے جرم ہے۔

۳۔ ارتداد کے جرم ہونے کے پیش نظر، اس کی سزا کے فلسفہ کو مندرجہ ذیل امور میں بیان کیا جاسکتا ہے:

الف: سزا کا حق:

مرتد کی سزا، ایک ایسی تعزیر ہے کہ معاشرہ کے اخلاقی نظم و انتظام میں ایجاد شدہ خرابی کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ جس قدر اخلاقی و مذہبی خرابی اور عام لوگوں کے حقوق زیادہ پامال ہوں، اس کی سزا اتنی ہی سنگین تر ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں دینی جذبات اور اعتقادات کمزور ہو جائیں، وہ معاشرہ حقیقی سعادت سے محروم ہوتا ہے، اگرچہ

ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ بھی ہو۔ اسی وجہ سے ارتداد کے علاوہ، ہر وہ کام، جو لوگوں کے اعتقادات و ایمان کو کمزور کرنے کا سبب بنے، اس کی سنگین سزا ہوتی ہے، جیسے: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی توہین کرنا، کیونکہ جب معاشرہ میں ان امور کا تقدس پامال ہو جائے، تو دین میں تحریف ایجاد ہونے اور دین کے نابود ہونے کی راہ کھل جاتی ہے۔

ب۔ مجرم کے ذریعہ ارتداد کی تبلیغ کو جاری رکھنے سے روکنا:

مرتد، جب تک اپنے ارتداد کا اظہار نہ کرے، وہ اجتماعی جرم کا مرتکب نہیں ہوتا ہے، اسلام کی طرف سے ارتداد کے لئے جو سنگین سزا معین کی گئی ہے، وہ ارتداد کی تبلیغ میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ج۔ معاشرہ میں دین کی اہمیت کا مظاہرہ کرنا:

ہر قانونی اور تعزیری نظام اپنے قوانین وضع کر کے اس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ اس کے لئے کون سے امور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ارتداد کے لئے سنگین سزا کا معین کرنا، معاشرہ کے ایمانی جذبہ کے تحفظ کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

د۔ دین کو قبول کرنے سے پہلے، اس میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کرنے کی ترغیب:

مرتد کی سزا، غیر مسلمانوں کو ترغیب دیتی ہے کہ اسلام کو پوری تحقیق کے بعد قبول کریں۔ یہ مسئلہ سست اور کمزور ایمان سے بچاتا ہے۔

ھ۔ اخروی سزا میں تخفیف:

دین کے مطابق، دنیوی سزا، اخروی سزا میں تخفیف پیدا ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔ خداوند متعال اس سے زیادہ مہربان ہے کہ انسان کو ایک گناہ کے لئے دو سزائیں

دے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں یہ اعتقاد موجود تھا کہ دنیوی سزا آخرت میں گناہ کے پاک ہونے کا سبب بنتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجرموں پر حد جاری کرنے کے لئے، اقبال جرم کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔

نوٹ: اگرچہ کم از کم دنیوی سزا، اخروی سزا کے تخفیف کا سبب بنتی ہے، لیکن خداوند متعال نے آخرت میں پاک ہونے کے لئے ایک اور صورت عنایت کی ہے اور وہ مخلصانہ طور پر توبہ ہے۔ اگر گناہگار مخلصانہ طور پر توبہ کرے تو دنیا میں شرعی سزا پائے بغیر اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ قانون سازی میں احتیاط: شائد، مرتد کی سزا کے فلسفہ کے عنوان سے مذکورہ موارد اور جو کچھ قرآن مجید میں اہل کتاب کی سازشوں کے بارے میں نازل ہوا ہے [12]، ان کے تمام مصادیق میں مرتد صادق نہ آتا ہو، یعنی مرتد شخص کسی صورت میں عام ایمان کے خلاف سازش کا قصد نہ رکھتا ہو یا اس کے ارتداد کے عام لوگوں کے ایمان پر منفی اثرات نہ پڑتے ہوں، پھر بھی اسلام نے اس کی سزا میں کسی قسم کی چھوٹ نہیں دی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ بہ الفاظ دیگر، ممکن ہے مرتد کی سزا سے متعلق امور میں سے کسی ایک امر میں یہ فلسفہ صادق نہ آتا ہو، پھر کیوں اسلام نے اس معاملہ میں بھی سزا رکھی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر قانون ساز حکم کے موضوع کے دائرہ کو اس کے فلسفہ سے وسیع تر قرار دیتا ہے کہ اسے قانون سازیہ میں احتیاط کہتے ہیں اور یہ چند نکات کی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں پر ان میں سے صرف دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

الف: بعض اوقات کسی موضوع کو حقیقی اور باریک بینی سے مشخص کرنے والی قید و شرط ایسی نہیں ہوتی ہے کہ ان کی تشخیص کی ذمہ داری کو انسان پر چھوڑ دیا جائے۔ مثلاً ایک سڑک پر گاڑی کو پارک کرنے کی ممانعت کا اصلی فلسفہ، اس سڑک پر ٹریفک کو کنٹرول کرنا ہے

اور یہ فلسفہ ٹریفک سے خالی دنوں میں معدوم ہو جاتا ہے، لیکن ٹریفک پولیس گاڑی کو اس سڑک پر پارک کرنے کو ہمیشہ ممنوع قرار دیتی ہے۔ کیونکہ وہ ٹریفک کے مشکلات کی تشخیص کو لوگوں پر نہیں چھوڑ سکتی ہے۔

ب۔ کبھی ایک حکم کی اس قدر اہمیت ہوتی ہے کہ قانون ساز احتیاط کے طور پر اس حکم کے موضوع کو وسیع تر قرار دے دیتا ہے تاکہ اسے یقین حاصل ہو جائے کہ لوگ حتمی طور پر اس حکم پر عمل کریں گے۔ فوج کی چھاونیوں کی مانند، مثلاً فوجی تنصیبات، جو لوگوں کی نظروں سے دور ہونی چاہئیں، پانچ کلومیٹر کے دائرہ میں حفاظت بندی سے محفوظ رہ سکتی ہوں، لیکن فوج ان تنصیبات کی اہمیت کے پیش نظر حفاظت بندی کو کئی گنا وسعت دیتی ہے تاکہ اس سے یہ مقصد پورا ہو جانے کا یقین ہو جائے۔

اسلامی سزاؤں کے فلسفہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ فلسفہ حقوق، تالیف: قدرت اللہ خسروشاہی۔ مصطفی دانش پژوہ، ص ۲۰۱۲۲۲،
۲۔ عدل الٰہی تالیف: شہید مرتضی مطہری رح
۳۔ تفسیر المیزان، علامہ طباطبائی رح، ج ۲، ص ۲۷۸ تفسیر آیہ لا اکراہ فی الدین
۴۔ تفسیر نمونہ، ج ۲، ص ۳۶۰

حواشی

[1] امام خمینی، تحریر الوسیلہ، ج2، ص366؛ ابن قدامہ، المغنی، ج10، ص74.

[2] ایضاً، ج1، ص118.

[3] ایضاً، ج2، ص336؛ بعض فقہا ولادت کے وقت والدین میں سے کسی ایک کے مسلمان ہونے کو شرط جانتے ہیں (خوئی، مبانی تکلمۃ المنہاج، ج2، ص 451) اور بعض دوسرے فقہا بالغ ہونے کے بعد اسلام کا اظہار شرط نہیں جانتے ہیں (شہید ثانی، مسالک الافہام، ج2، ص 451).

[4] امام خمینی، تحریر الوسیلہ، ج2، ص336.

[5] ایضاً، ج2، ص494.

[6] الجزیری، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ج5، ص424؛ ابوحنیفہ نے شیعوں کے مانند مرد اور عورت میں فرق کیا ہے۔ (ابوبکر الکاسانی، بدایع الصنایع، ج7، ص135) اور حسن بصری توبہ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے ہیں (ابن قدامہ، المغنی، ج10، ص76).

[7] ملاحظہ ہو: عہد قدیم: سفر توریہ مثنی، فصل 13؛ کتاب مقدس، ترجمہ فارسی ولیم گلن، دار السلطنہ ، لندن، 1856 میلادی، ص 357۔8؛ الکتاب المقدس، دار المشرق، بیروت، سفر ثنیۃ الاشتراع، الفصل 13، ص 379۔80۔ عہد جدید ساز مان ترجمہ تفسیری کتاب مقدس، تہران، 1357، ص305۔6۔

[8] البتہ بعض ارتداد کے لئے موت کی سزا کو حکم تعزیری جانتے ہیں نہ حد، اور ان کا اعتقاد ہے کہ تعزیرات مکمل طور پر حاکم کے ہاتھ میں ہیں اور اس میں اس کے لئے کوئی خاص صورت معین نہیں ہوئی ہے، لہذا نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مطابق ارتداد کی سزا موت ہے۔ ملاحظہ ہو: حسینعلی منتظری، دراسات فی ولایۃ الفقیہ و فقہ الدولۃ الاسلامیۃ، ج3، ص387؛ مزید ملاحظہ ہو: عیسیٰ ولایی، ارتداد در اسلام، ص 148۔ 129.

[9] خداوند متعال نے ارشاد فرمایا ہے: لا یکلف اللّٰہ نفساً الّا وسعہا، بقرہ، 286.

[10] حج، 32.

[11] مائدہ، 2.

[12] آل عمران، 72.

کیا انسان اپنے کام میں مختار ہے؟

مختصر جواب

ہم زندگی میں بارہا اپنے آپ کو ایک راہ پر تنہا اور اجنبی پاتے ہیں۔ یہ وہ راہ ہے جس پر چلنے کے سوا ہمارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہماری زندگی کی پائدار اور پہلے سے معین شدہ امور کی راہ، یعنی نسل، قومیت، خاندان اور قد وقامت وغیرہ جیسے امور کی راہ، لیکن اس کے مقابلے میں ہم اپنی زندگی میں خود کو حیرانی و پریشانی کی راہوں پر پاتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال جو ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟ اور کس راہ کا انتخاب کریں؟

حقیقت میں، کون سا، کیوں اور کیا جیسے الفاظ ہمارے انتخاب کے لئے ہمارے اختیار میں ہیں۔

لیکن انسانی دائرہ اختیار کے بارے میں کہنا چاہئے کہ: نہ ہم اپنے اختیاری کاموں کو انجام دینے میں علت تامہ ہیں اور نہ ہم اپنے کاموں میں کسی اختیار کے بغیر مجبور و مضطر ہیں بلکہ ہم ایک فعل کو انجام دینے میں تمام شرائط و مقدمات اور علل رکھنے کے باوجود ایک علت ناقصہ ہیں، لیکن اگر یہی علت ناقصہ، یعنی ہمارا اختیار و ارادہ نہ ہوتا، تو ہمارا کام انجام نہیں پاتا۔

تفصیلی جواب

جو فعل انسان انجام دیتا ہے، وہ عالم خلقت کا ایک مظہر ہے اور اس کی پیدائش، دنیا کے دوسرے مظاہر کے مانند مکمل طور پر علت سے وابستہ ہے اور چونکہ انسان خلقت عالم کا ایک جزو ہے اور عالم کے دوسرے اجزا کے ساتھ وجودی رابطہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے اجزاء اس کے فعل میں بے اثر نہیں ہوں گے[1]۔

مثال کے طور پر انسان جو روٹی کا لقمہ کھاتا ہے، اس فعل کو انجام دینے کے لئے، چونکہ ہاتھ پاؤں، منہ، علم، قدرت اور ارادہ جیسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس فعل کو انجام دینے کے لئے خارج میں روٹی کا مہیا ہونا، کسی رکاوٹ کا نہ ہونا اور زمان و مکان کے لحاظ سے دوسری شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے موجود نہ ہونے سے فعل انجام نہیں پا سکتا ہے اور ان سب وسائل کا موجود ہونا (یعنی علت تامہ کا متحقق ہونا) تحقق فعل کے لئے ضروری ہے[2]۔ (علت تامہ= تمام علتوں اور ایک فعل کے انجام دینے کی شرائط یا ایک شے کا پیدا ہونا۔)

اب جبکہ خداوند متعال ہم سب کا صاحب و مالک ہے، اس نے ارادہ کیا ہے کہ انسان اپنے اختیاری کاموں میں اپنے ارادہ سے سرچشمۂ اثر ہوتا ہے، یعنی اگر ایک حادثہ کے رونما ہونے کے لئے مثال کے طور پر پانچ شرائط اور علتیں ضروری ہوں تو ان علتوں میں سے ایک انسان کا اختیار و ارادہ ہے، فرض کیجئے ایک بجلی لیمپ کو روشن کرنے کے لئے تمام ضروری وسائل، پورے طور پر مہیا ہونے چاہئے، یعنی سویچ، تار، لیمپ، بجلی کا بورڈ، کارخانہ اور بجلی گھر تک تار کا سلسلہ اور تاروں میں بجلی کا کرنٹ وغیرہ۔ اب لیمپ کو روشن کرنے کی علتوں میں سے ایک بجلی کا بٹن دبانا ہے کہ اس مثال میں جب ہمارے اختیاری کام کی تمام شرائط مہیا ہیں، تو بجلی کا بٹن دبانا ہمارے اختیار میں ہے اور خداوند متعال نے چاہا کہ جب تک نہ انسان

اپنے اختیار سے کسی حادثہ کے بجلی کے بٹن کو نہ دبائے (اختیاری کاموں میں) اس حادثہ کا لیمپ روشن نہیں ہوگا۔ علت تامہ کے مجموعی اجزاء کی بہ نسبت فعل کا ضروری ہونا اس سے منافات نہیں رکھتا ہے کہ انسان جو علت تامہ کے اجزاء میں سے ایک ہے، کی بہ نسبت فعل کا ہونا ممکنات میں سے ہو۔ پہلی والی مثال میں صحیح ہے کہ اگر تمام علل و شرائط پوری ہوں تو لیمپ روشن ہوگا، لیکن کیا انسان کے ذریعہ بجلی کے بٹن کو دبانا بھی ضروری ہے یا یہ کہ یہ ممکن ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ بجلی کے بٹن کو دبانے کے سلسلہ میں انسان کی مرضی کی صورت میں تمام علتیں مل جاتی ہیں اور ضروری طور پر لیمپ روشن ہوتا ہے اور اس کام کی بہ نسبت انسان کی یہی مرضی یا عدم مرضی، امکان کی نسبت کو واضح کرتی ہے اور اس لئے انسان، امکان، یعنی کام کا اختیار رکھتا ہے اور علت کے مجموعی اجزاء کی بہ نسبت فعل کا ضروری ہونا، بعض اجزاء، جن میں انسان بھی شامل ہے کے ساتھ فعل کی نسبت کے ضروری ہونے کا سبب نہیں ہے۔

ایک سیدھا سادہ انسان بھی اس نظریہ کی تائید کرتا ہے، کیونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ لوگ اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر کھانے، پینے، آمدورفت جیسی چیزوں اور صحت، بیماری، بڑے اور چھوٹے قد کے درمیان فرق رکھتے ہیں اور اس کی پہلی قسم، جو براہ راست انسان کی مرضی سے تعلق رکھتی ہے، انسان کے اختیار میں جان کر امر و نہی اور ستائش اور مزمت کرتے ہیں، اس کے برعکس دوسری قسم میں انسان کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

صدر اسلام میں، انسان کے افعال کے سلسلہ میں اہل سنت کے درمیان دو نظریئے پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ انسان کے افعال کو خداوند متعال کے نا قابل تغیر ارادہ سے مربوط جان کر، انسان کو اپنے افعال میں مجبور جانتے تھے اور انسان کے ارادہ و اختیار کے قائل نہیں تھے اور دوسرے گروہ سے متعلق لوگ انسان کو اپنے فعل میں آزاد جانتے تھے اور اس کے فعل کو خدا کے ارادہ سے متعلق نہیں جانتے تھے اور اسے قدر کے حکم

سے خارج جانتے تھے۔ لیکن اہلبیتؑ پیغمبرؐ کی تعلیمات کے مطابق جو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات ہیں، انسان اپنے فعل میں مختار ہے، لیکن آزاد نہیں ہے بلکہ خداوند متعال اختیار کی راہ سے فعل کو چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، خداوند متعال علت تامہ کے مجموعی اجزاء کی راہ سے، جن میں سے ایک انسان کا ارادہ و اختیار بھی ہے، فعل کو چاہتا ہے اور ضروری قرار دیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں فعل ضروری ہے اور انسان بھی اس میں مختار ہے، یعنی فعل اپنے اجزاء علت کی بہ نسبت ضروری اور ان اجزا میں سے ایک، جو انسان ہے، کی بہ نسبت اختیاری اور ممکن ہے [3]۔

اس سلسلہ میں مفید کتابیں حسب ذیل ہیں:

الف۔ انسان شناسی تالیف: محمود رجبی، فصل ۵ و ۶

ب۔ آموزش فلسفہ تالیف: مصباح یزدی، ج ۲، درس ۶۹

ج۔ عدل الٰہی تالیف: مرتضٰی مطہری

حواشی

[1] علت یا اس طرح ہے کہ معلول کے محقق ہونے کے لئے کافی ہے اور معلول کا وجود اس کے علاوہ کسی اور چیز پر متوقف نہیں ہے، اس کے وجود کے فرض پر، معلول کا وجود ضروری ہے کہ اس صورت میں اسے علت تامہ کہتے ہیں، اور یا اس طرح ہے کہ اگر چہ معلول اس کے بغیر محقق نہیں ہوتا ہے، لیکن وہ خود بھی اکیلے ہی معلول کے وجود کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس پر ایک یا کئی چیزوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے تا کہ معلول کا وجود ضرورت پیدا کرے، اس صورت میں اس کو علت ناقصہ کہتے ہیں۔

[2] طباطبائی سید محمد حسین، شیعہ در اسلام، ص ۷۸

[3] ایضاً۔ ص ۷۹۔